ماہِ تمام

کلیات



پروین شاکر

Mahmood Ali Collection

ماہِ تمام

کلیات

پروین شاکر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© Reserved

MAH-E-TAMAM

BY

PARVEEN SHAKIR

1995

Price Rs. 150.00

I S B N : 81-86232-17-6

سنہ اشاعت ____________

قیمت ____________ ۱۵۰/- روپے

مطبع ____________ فوٹو آفسیٹ پرنٹرس، بلی ماران، دہلی

Published by

Educational Publishing House

3108 GALI AZIZUDDIN VAKIL, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-110 006 (INDIA)

Tel 526162/7774965

خوشبو

صد برگ

خود کلامی

انکار

خوشبو

پروین شاکر

اپنے

عمّو کے نام

جو

باقی دُنیا کے لئے

احمد ندیم قاسمی

ہیں

خوشبو آج سے تیرہ برس قبل آپ کے سامنے آئی ——
آپ نے اس کی جس طرح پذیرائی کی —— یہ آپ جانتے ہیں
—— مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ محبت کے روایتی تحفوں
میں ایک کتاب کا اضافہ ہو گیا ہے۔

اس پذیرائی کا ایک بار پھر شکریہ!

پروین شاکر
مئی ۸۹ء
اسلام آباد

ترتیب

دریچۂ گُل سے

گریز پا لمحوں کی ٹوٹتی ہوئی دہلیز پر، ہوا کے بازو تھامے، ایک لڑکی کھڑی ہے اور سوچ رہی ہے کہ اسے آپ سے کیا کہنا ہے۔ برس بیتے، گئی رات کے کسی ٹھہرے ہوئے سناٹے میں اس نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ اس پر اس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دے۔ مجھے یقین ہے، یہ سن کر اس کا خدا اِس دعا کی سادگی پر ایک بار تو ضرور مسکرایا ہوگا! (کچی عمروں کی لڑکیاں نہیں جانتیں کہ آشوبِ آگہی سے بڑا عذاب زمین والوں پر آج تک نہیں اترا) پر وہ اس کی بات مان گیا — اور اسے چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہرِ ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا!

شہرِ ذات — کہ جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں اور جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں!

بات یہ نہیں کہ فصیلِ شہرِ جاں کی زرد بیلوں پر کبھی کسی کا جمال، صورتِ سحاب نہیں اترا، یا اس شہر کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو نہیں کھیلی — یہاں تو ایسے موسم بھی اترے کہ جب بہار نے آنکھوں پر پھول باندھ دیئے تھے اور حصارِ رنگ سے رہائی دشوار ہو گئی تھی — مگر جب ہوا کے دل میں برہنہ شاخیں گڑ جائیں تو بہار کے ہاتھوں سے سارے پھول گر جاتے ہیں!

انہی پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے، آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی — شہر کی اس سنسان گلی تک آپہنچی ہے کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دور، دور تک کرچیاں بکھری ہوئی ہیں — ایسا نہیں ہے کہ اس نے اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی نہیں کی — کی — پر اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہولہان ہو گئیں! اور خوشبو، اسی سفر کی کہانی ہے! حیران آنکھوں، شبنمیں رخساروں اور اداس مسکراہٹ والی اس لڑکی کو اعتراف ہے کہ یہ کہانی نئی نہیں ہے (اور یہی کیا، دنیا کی کوئی کہانی نئی نہیں ہے

یہ تو ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو اس کو ایسا سُندر بنا دیتا ہے کہ سنسار کا من موہ لے!

پھر خود کو پانے کی جستجو میں اپنا آپ کھو دینا تو بڑی پرانی بات ہے ـــــ پر ہے بہت سچی اور ناگزیر!ـــ ندرت جذبوں کے جمال کا معیار نہیں ہُوا کرتی ـــــ جذبے کا حسن تو اُس کی سچائی ہے اور اظہار کی دلکشی اُس کا اعتماد ہے۔ سو یہ لڑکی بھی جب آپ سے بات کرے گی تو اُس کی پلکیں بے شک بھیگی ہُوئی ہوں گی ـــــ لیکن ذرا غور سے دیکھیے گا ـــــ اُس کا سر اُٹھا ہوا ہے!

رات کے پیاسے ہاتھوں سے اپنے خوابوں کا خالی جام کس نے واپس لیا ہے اور پھر اس صورت میں کہ جب وہ شکستہ بھی ہو! کرچیاں آنکھوں میں چبھی رہ جاتی ہیں ـــــ جن سے نئے دن کے سورج کی کرنوں کا ٹکراؤ، دھنک رنگا دھنک رنگوں کے جال بچھاتا رہتا ہے ـــــ اور چشمِ خوں بستہ، آنے والی رات لہو ٹپکنے تک اس فریبِ سرور میں رہتی ہے کہ آزار گیا! اس خوش گمانی کا زہر جب تن بدن میں گھل جائے، تو جسم کے شجر پر ایک موسم بڑی دیر تک ٹھہر جاتا ہے ـــــ زخموں کے، پھُول بننے کا موسم!

ہوا نے جب پھُول کو چُوما تو خوشبو نے جنم لیا ـــــ خوشبو جو کھلتی ہُوئی کلی کی مسکراہٹ بھی ہے اور مرجھاتے ہُوئے شگوفے کا نوحہ بھی، جو ہوا کی سانسوں میں اُتر کر، خزاں نصیب درختوں کی مسیحائی کرتی ہے اور اس عمل میں خود جاں سے بھی گزر جاتی ہے، خوشبو جو محبت کی طرح ہفت آسماں، دوستی کی طرح مہرباں، نیکی کی طرح یاد رہنے والی اور رفاقت کی طرح دکھ بٹانے والی ہے، جو بچپن کی سہیلی کی طرح جلتے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور ماں کی طرح، پل بھر میں، وجود کے سارے دُکھ چُن لیتی ہے!

مگر ـــــ جس کا مقدر وحشت ہے!
جس کے ماتھے پر ہوا کی انگلیوں نے بے سرو سامانی لکھ دی ہے!
جس کا کوئی گھر نہیں!
جس کی زندگی کوچہ نوردی ہے، آبلہ پائی ہے، پریشان بدنی ہے!
اور جسے تھک کر کسی دیوار سے ٹیک لگانے، کسی چھاؤں میں آنکھیں موند لینے کی اجازت نہیں!
کہ
سفر اس کا تعاقب کر رہا ہے

دُکھ کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا ـــــ اس کا آہنگ وہی ہے جو موسیقی کا ہے کہ جب تک سارے سُر سچے نہ لگیں، گلے میں نور نہیں آتا! ـــــ دل کے سب زخم لو نہ دیں تو حرف میں روشنی نہیں آتی!

وجود کے سُر تیور بھی ہوتے ہیں اور کومل بھی ـــــ تیور سُر عذاب لاتے ہیں اور کومل خواب! ـــــ کبھی چیخ ـــــ کبھی کراہ ـــــ کبھی سسکی ـــــ اور کبھی گفتگو، کبھی سرگوشی اور کبھی محض خود کلامی! ـــــ
"خوشبو" کی اُونچی آواز آپ کو شاید ہی سنائی دے ـــــ کہ عذابوں کی پذیرائی کرتے ہُوئے بھی اس لڑکی کے ہاتھوں میں گلاب ہی رہے ـــــ مگر لہجے کی اس صبا فامی سے پہلے ایک رات ضرور آتی ہے ـــ

اپنی آگ میں جل بجھنے کی رات ! ـــــ کہ اندر کی آگ عام ہوئی تو کوئلہ ـــــ اور باہر کی تپش سے بڑھ گئی تو قفنس سویدا، بہشت پہلوی ہیرا بن کر جگمگا اٹھا !

کچھ کم گوش یہ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کی شاعری میں سوائے بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ چڑیوں کے گیتوں اور اس کی اپنی سرگوشیوں کے، اور کچھ نہیں ــــ !

اگر زندگی سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ لڑکی پورے خلوص کے ساتھ اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہے ـ نیم خوابی کا فسوں بڑی دیر سے ٹوٹتا ہے ــــ پر جب ایسا ہوا تو روزن زنداں سے آتی ہوئی، جنبی سیاہ بخت سرزمینوں کی ہوا کے آنسوؤں کو اس نے اپنی پلکوں پر محسوس کیا ہے ـ ان کا نمکین ذائقہ اس کی شبیہ آشنا زباں نے چکھا ہے لیکن جو لڑکی بسنت بہار کی نرم ہنسی میں بھیگ چکی ہو اسے خزاں سے دکھ تو ہو سکتا ہے عناد نہیں ــــ جس کے اکیلے گھر میں شریر چڑیا کا گیت چہرے اُگا چکا ہو اسے سناٹے سے وحشت تو ہو سکتی ہے، نفرت نہیں !

ہاں ــــ ضرور کہیں زمین بدصورت بھی ہوگی ــــ مگر اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا ــ ماں سے محبت کرتے ہوئے اس کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا !

محبت جب تقاضائے جسم وجاں سے ماوراء ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے ـ حسن جب لطافت کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے ــــ خوشبو حسن کی تکمیل ہے ! اس سے کوئی سخن فہم یہ نہ جانے کہ اس لڑکی کو تکمیلِ حسن کا دماغ ہے ــــ تکمیلِ حسن کا خیال صرف اسے زیب دیتا ہے جس نے تخلیق حسن کی ــــ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آپ سے بچھڑنے سے پہلے یہ لڑکی دو خوشبو ــ کا تعارف بڑے اعتماد سے کر رہی ہے ــــ اس لیے کہ تخلیق کے تمام لمحوں میں وہ صرف اپنے وجدان کے سامنے جواب دہ تھی اور اس کے وجدان نے اس کے کانوں میں یہی سرگوشی کی ہے کہ وہ لمحہ آگیا ہے جب وہ خوشبو کا تحفہ ہوا کے ہاتھ میں دے سکتی ہے !

کراچی
ستمبر ۷۶ء

پروین شاکر

سرِ شاخِ گُل

(نذرِ احمد ندیم قاسمی)

وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دُور، بہت دُور ہے، مگر اُس کی
لطیف چھاؤں
سجل، نرم چاندنی کی طرح
مرے وجود، مری شخصیت پہ چھائی ہے:
وہ ماں کی بانہوں کی مانند مہرباں شاخیں
جو ہر عذاب میں مجھ کو سمیٹ لیتی ہیں
وہ ایک مشفق دیرینہ کی دعا کی طرح
شریر جھونکوں سے پتّوں کی نرم سرگوشی
کلام کرنے کا لہجہ مجھے سکھاتی ہے

وہ دوستوں کی حسین مسکراہٹوں کی طرح
شفق عذار، دھنک پیرہن شگوفے، جو —
مجھے زمیں سے محبت کا درس دیتے ہیں!

اُداسیوں کی کسی جانگداز ساعت میں
میں اُس کی شاخ پہ سر رکھ کے جب بھی روئی ہوں
تو میری پلکوں نے محسوس کر لیا فوراً
بہت ہی نرم سی اک پنکھڑی کا شیریں لمس!
نمی تھی آنکھ میں لیکن میں مسکرائی ہوں!

کڑی ہے دھوپ
تو پھر برگ برگ ہے شبنم
تپاں ہوں لہجے
تو پھر پھول پھول ہے ریشم
ہرے ہوں زخم
تو سب کونپلوں کا رس مرہم!

وہ ایک خوشبو
جو میرے وجود کے اندر
صداقتوں کی طرح زینہ زینہ اُتری ہے
کِرن کِرن مری سوچوں میں جگمگاتی ہے
(مجھے قبول، کہ وجداں نہیں یہ چاند مرا
یہ روشنی مجھے ادراک دے رہی ہے مگر !)

وہ ایک جھونکا
جو اُس شہرِ گُل سے آیا تھا
اب اس کے ساتھ بہت دُور جاچکی ہوں میں
میں ایک ننھی سی بچّی ہوں اور خموشی سے
بس اس کی اُنگلیاں تھامے، اور آنکھیں بند کیے
جہاں جہاں لیے جاتا ہے، جارہی ہوں میں !

وہ سایہ دار شجر
جو دن میں میرے لیے ماں کا نرم آنچل ہے

وہ رات میں، مرے آنگن پہ ٹھہرنے والا
شفیق، نرم زباں، مہربان بادل ہے

مرے دریچوں میں جب چاندنی نہیں آتی
جو بے چراغ کوئی شب اُترنے لگتی ہے
تو میری آنکھیں کرن کے شجر کو سوچتی ہیں
دبیز پردے، نگاہوں سے ہٹنے لگتے ہیں
ہزار چاند، سرِ شاخِ گُل اُبھرتے ہیں!

اجنبی

کھوئی کھوئی آنکھیں
بکھرے بال
شکن آلود قبا
لُٹا لُٹا اِنساں !
سائے کی طرح سے میرے ساتھ رہا کرتا ہے ـــ لیکن
کسی جگہ مِل جائے تو
گھبرا کے مُڑ جاتا ہے
اور پھر دُور سے جا کر مجھ کو تکنے لگتا ہے
کون ہے یہ ؟

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

اُلجھن

رات ابھی تنہائی کی پہلی دہلیز پہ ہے
اور میری جانب اپنے ہاتھ بڑھاتی ہے
سوچ رہی ہوں
ان کو تھاموں
زینہ زینہ سناٹوں کے تہہ خانوں میں اتروں
یا اپنے کمرے میں ٹھہروں
چاند مری کھڑکی پہ دستک دیتا ہے !

احتیاط

سوتے میں بھی
چہرے کو آنچل سے چھپائے رہتی ہوں
ڈر لگتا ہے
پلکوں کی ہلکی سی لرزش
ہونٹوں کی موہوم سی جنبش
گالوں پر رہ رہ کے اُترنے والی دھنک
لہو میں چاند رچاتی اس ننھی سی خوشی کا نام نہ لے لے
نیند میں آئی ہوئی مُسکان
کسی سے دل کی بات نہ کہہ دے !

اعتراف

جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہو گئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیے آہستہ سے!

کشف

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کھلی
خواب دکھلا کے مجھے
نیند کس سمت چلی
خوشبو لہرائی، مرے کان میں سرگوشی کی
اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سنی
اور پھر جان گئی
میری آنکھوں میں ترے نام کا تارہ چمکا!

کانچ کی سُرخ چُوڑی

کانچ کی سُرخ چُوڑی
مرے ہاتھ میں
آج ایسے کھنکنے لگی
جیسے کل رات، شبنم سے لکھی ہوئی
تیرے ہاتھ کی شوخیوں کو
ہواؤں نے سُر دے دیا ہو!

گماں

میں کچی نیند میں ہوں
اور اپنے نیم خوابیدہ تنفس میں اُترتی
چاندنی کی چاپ سنتی ہوں
گماں ہے
آج بھی شاید
مرے ماتھے پہ تیرے لب، ستارے ثبت کرتے ہیں!

پیار

ابرِ بہار نے
پھول کا چہرہ
اپنے بنفشی ہاتھ میں لے کر
ایسے چُوما
پھول کے سارے دُکھ
خوشبو بن کر بہہ نکلے ہیں!

نوید

سماعتوں کو نوید ہو — کہ
ہوائیں خوشبو کے گیت لے کر
دریچۂ گُل سے آ رہی ہیں!

کھلی آنکھوں میں سپنا جھانکتا ہے
وہ سویا ہے کہ کچھ کچھ جاگتا ہے

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن، مور بن کر ناچتا ہے

مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے

میں اُس کی دسترس میں ہوں، مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

کسی کے دھیان میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

سڑک کو چھوڑ کر چلنا پڑے گا
کہ میرے گھر کا کچا راستہ ہے

رقص میں رات ہے بدن کی طرح
بارشوں کی ہوا میں، بن کی طرح

چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ
میرے بستر کی ہر شکن کی طرح

چاک ہے دامنِ قبائے بہار
میرے خوابوں کے پیرہن کی طرح

زندگی، تجھ سے دور رہ کر، میں
کاٹ لوں گی جلا وطن کی طرح

مجھ کو تسلیم، میرے چاند کہ میں
تیرے ہمراہ ہوں گہن کی طرح

بارہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں اک دُلہن کی طرح

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہُوئی جیسے دُلہن کی خوشبو

پیرہن میرا مگر اُس کے بدن کی خوشبو
اُس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

موجۂ گُل کو ابھی اِذنِ تکلّم نہ ملے
پاس آتی ہے کسی نرم سخن کی خوشبو

قامتِ شعر کی زیبائی کا عالم مت پُوچھ
مہرباں جب سے ہے اُس سرو بدن کی خوشبو

ذکر شاید کسی خورشید بدن کا بھی کرے
کُو بہ کُو پھیلی ہُوئی میرے گہن کی خوشبو

عارضِ گُل کو چھُوا تھا کہ دھنک سی بکھری
کس قدر شوخ ہے ننّھی سی کرن کی خوشبو

کس نے زنجیر کیا ہے رمِ آہُو چشماں
نکہتِ جاں ہے انہیں دشت و دمن کی خوشبو

اس اسیری میں بھی ہر سانس کے ساتھ آتی ہے
صحنِ زنداں میں انہیں دشتِ وطن کی خوشبو

ایکسٹیسی[1]

سبز مدھم روشنی میں سُرخ آنچل کی دھنک
سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں کی مہک
بازوؤں کے سخت حلقے میں کوئی نازک بدن
سلوٹیں ملبوس پر، آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہوا
گرمیٔ رخسار سے دہکی ہوئی ٹھنڈی ہوا
نرم زلفوں سے ملائم اُنگلیوں کی چھیڑ چھاڑ
سُرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس
ریشمیں باہوں میں چوڑی کی کبھی مدھم کھنک
شرمگیں لہجوں میں دھیرے سے کبھی چاہت کی بات
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی اک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف اک دُعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں ٹھہر جائیں ذرا!

[1] ECSTACY

ایک شعر

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

پرزم

پانی کے اک قطرے میں
جب سورج اُترے
رنگوں کی تصویر بنے
دھنک کی ساتوں قوسیں
اپنی باہیں یوں پھیلائیں
قطرے کے ننھے سے بدن میں
رنگوں کی دنیا کھنچ آئے !

میرا بھی اک سورج ہے
جو میرا تن چھو کر مجھ میں
قوسِ قزح کے پھول اُگائے
ذرا بھی اُس نے زاویہ بدلا
اور میں ہو گئی
پانی کا اک سادہ قطرہ
بے منظر، بے رنگ !

گئے جنم کی صدا

وہ ایک لڑکی ___
کہ جس سے شاید میں ایک پل بھی نہیں ملی ہوں
میں اُس کے چہرے کو جانتی ہوں
کہ اُس کا چہرہ
تمہاری نظموں، تمہارے گیتوں کی چلمنوں سے اُبھر رہا ہے
یقین جانو
مجھے یہ چہرہ تمہارے اپنے وجود سے بھی عزیز تر ہے
کہ اُس کی آنکھوں میں
چاہتوں کے وہی سمندر چھُپے ہیں
جو میری اپنی آنکھوں میں موجزن ہیں
وہ تم کو اک دیوتا بنا کر، مری طرح پوجتی رہی ہے
اُس ایک لڑکی کا جسم
خود میرا ہی بدن ہے
وہ ایک لڑکی ___
جو میرے اپنے گئے جنم کی مدُھر صدا ہے !

پہلے پہل

شکن چُپ ہے
بدن خاموش ہے
گالوں پہ ویسی تمتماہٹ بھی نہیں، لیکن
میں گھر سے کیسے نکلوں گی
ہوا، چنچل سہیلی کی طرح باہر کھڑی ہے
دیکھتے ہی مسکرائے گی !
مجھے چھُو کر تری ہر بات پالے گی
تجھے مجھ سے چُرا لے گی
زمانے بھر سے کہہ دے گی، میں تجھ سے مل کے آئی ہوں !
ہوا کی شوخیاں یہ
اور میرا بچپنا ایسا
کہ اپنے آپ سے بھی میں
تری خوشبو چھپاتی پھر رہی ہوں !

قریۂ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے
وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے

میرے ویران دریچوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ مرے گھر کے در و بام سجانے آئے

اُس سے اِک بار تو رُوٹھوں میں اُسی کی مانند
اور مری طرح سے وہ مجھ کو منانے آئے

اسی کوچے میں کئی اُس کے شناسا بھی تو ہیں
وہ کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے

اب نہ پوچھوں گی میں کھوئے ہوئے خوابوں کا پتہ
وہ اگر آئے تو کچھ بھی نہ بتانے آئے

ضبط کی شہر پناہوں کی، مرے مالک! خیر
غم کا سیلاب اگر مجھ کو بہانے آئے

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اُس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اُس کی

میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اُس کی

شوخ لمحوں کا پتہ دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اُس کی

ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
صبحیں جب اپنی تھیں، شامیں اُس کی

دھیان میں اُس کے یہ عالم تھا کبھی
آنکھ مہتاب کی یادیں اُس کی

رنگ جوئندہ وہ، آئے تو سہی!
پھول تو پھول ہیں، شاخیں اُس کی

فیصلہ موجِ ہوا نے لکھا!
آندھیاں میری، بہاریں اُس کی

خود پہ بھی کھُلتی نہ ہو جس کی نظر
جانتا کون زبانیں اُس کی

نیند اِس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اُس کی

دُور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے بانہیں اُس کی

کنگن بیلے کا

اُس نے میرے ہاتھ میں باندھا
اُجلا کنگن بیلے کا
پہلے پیار سے تھامی کلائی
بعد اُس کے ہولے ہولے پہنایا
گہنا پھولوں کا
پھر جھک کر ہاتھ کو چُوم لیا!
پھول تو آخر پھول ہی تھے
مُرجھا ہی گئے
لیکن میری راتیں ان کی خوشبو سے اب تک روشن ہیں
باہوں پر وہ لمس ابھی تک تازہ ہے
(شاخِ صنوبر پر اک چاند دَمکتا ہے!)
پھول کا گہنا
پریم کا کنگن
پیار کا بندھن
اب تک میری یاد کے ہاتھ سے لپٹا ہُوا ہے!

U-109536

دھیان

ہرے لان میں
سُرخ پھولوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی
میں تجھے سوچتی ہوں
مری اُنگلیاں
سبز پتّوں کو چھُوتی ہوئی
تیرے ہمراہ گزرے ہوئے موسموں کی مہک چن رہی ہیں
وہ دِل کُش مہک
جو مرے ہونٹ پہ آکے ہلکی گلابی ہنسی بن گئی ہے !

دُور اپنے خیالوں میں گُم
شاخ در شاخ
اک تیتری، خوشنما پَر سمیٹے ہُوئے، اُڑ رہی ہے
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
جیسے مجھ کو بھی پَر مل گئے ہوں !

عکسِ خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

کانپ اُٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

جس طرح خواب مرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

میں تو اُس دن سے ہراساں ہوں کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس اُمید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں، آئے کوئی

واہمہ

تمہارا کہنا ہے
تم مجھے بے پناہ شدّت سے چاہتے ہو
تمہاری چاہت
وصال کی آخری حدوں تک
مرے — فقط میرے نام ہوگی
مجھے یقیں ہے — مجھے یقیں ہے،
مگر قسم کھانے والے لڑکے !
تمہاری آنکھوں میں ایک تِل ہے !

ہتھیلیوں کی دُعا پھول لے کے آئی ہو
کبھی تو رنگ مرے ہاتھ کا حِنائی ہو!

کوئی تو ہو جو مرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہَوا میرے نام لائی ہو!

گلابی پاؤں مرے چمپئی بنانے کو
کسی نے صحن میں مہندی کی باڑھ اُگائی ہو!

کبھی تو ہو مرے کمرے میں ایسا منظر بھی
بہار دیکھ کے کھڑکی سے مُسکرائی ہو!

وہ سوتے جاگتے رہنے کے موسموں کا فسوں
کہ نیند میں ہوں مگر نیند بھی نہ آئی ہو!

وہ رُت بھی آئی کہ میں پھول کی سہیلی ہُوئی
مہک میں چمپا کلی ، رُوپ میں چنبیلی ہُوئی

میں سرد رات کی برکھا سے کیوں نہ پیار کروں
یہ رُت تو ہے مرے بچپن کی ساتھ کھیلی ہُوئی

زمیں پہ پاؤں نہیں پڑ رہے تکبّر سے
نگارِ غم کوئی دُلہن نئی نویلی ہُوئی

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اُس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی

جو حرفِ سادہ کی صُورت ہمیشہ لکھی گئی
وہ لڑکی تیرے لئے کس طرح پہیلی ہُوئی

ہم سے جو کچھ کہنا ہے وہ بعد میں کہہ
اچھی ندیا! آج ذرا آہستہ بہہ

ہَوا! مِرے جُوڑے میں پھول سجاتی جا
دیکھ رہی ہوں اپنے من موہن کی رہ

اُس کی خفگی جاڑے کی نرماتی دُھوپ
پاَرو سکھی! اِس حدت کو ہنس کھیل کے سہہ

آج تو سچ مچ کے شہزادے آئیں گے
ننديا پیاری! آج نہ کچھ پریوں کی کہہ

دوپہروں میں جب گہرا سناٹا ہو
شاخوں شاخوں موجِ ہوا کی صورت بہہ

بعد مدّت اُسے دیکھا، لوگو
وہ ذرا بھی نہیں بدلا، لوگو

خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اُس کے چہرے پہ لکھا تھا، لوگو

اُس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا، لوگو

اجنبی بن کے جو گزرا ہے ابھی
تھا کسی وقت میں اپنا، لوگو

دوست تو خیر کوئی کس کا ہے
اُس نے دُشمن بھی نہ سمجھا، لوگو

رات وہ درد مرے دل میں اُٹھا
صبح تک چین نہ آیا، لوگو

پیاس صحراؤں کی پھر تیز ہوئی
ابر پھر ٹوٹ کے برسا، لوگو

نُنؑ

وہ میری ہم سبق
زمین پر جو ایک آسمانی رُوح کی طرح سفر میں ہے
سفید پیرہن، گلے میں نقرئی صلیب
ہونٹ — مستقل دُعا !
میں اُس کو ایسے دیکھتی تھی جیسے ذرہ آفتاب کی طرف نظر اُٹھائے !
پر — یہ کل کا ذکر ہے
کہ جب میں اپنے بازوؤں پہ سر رکھے
ترے لئے بہت اُداس تھی
تو وہ مرے قریب آئی
اور مجھ سے کیٹسؔ کے لکھے ہُوئے کسی خیال تک رسائی چاہنے لگی
سو میں نے اُس کو شاعرِ جمال کی شریکِ خواب، فینیؔ کا پتہ دیا
مگر وہ میری بات سُن کے سادگی سے بولی :
"پیار کس کو کہتے ہیں ؟"
میں لمحہ بھر کو گنگ رہ گئی !

NUN نُنؑ

دماغ سوچنے لگا
یہ کتنی بدنصیب ہے
جو چاہتوں کی لذتوں سے بے خبر ہے
میں نے اُس کی سمت پھر نگاہ کی
اور اُس سمے
مجھے مری محبتیں تمام تر دکھوں کے ساتھ یاد آ گئیں
محبتوں کے دُکھ — عظیم دُکھ !
مجھے لگا
کہ جیسے ذرّہ — آفتاب کے مقابلے میں بڑھ گیا !

اُس وقت

جب آنکھ میں شام اُترے
پلکوں پہ شفق پھُولے
کاجل کی طرح ، میری
آنکھوں کو دھنک چھُولے
اُس وقت کوئی اُس کو
آنکھوں سے مری دیکھے
پلکوں سے مری چوُمے!

ایک شعر

ہمیں خبر ہے' ہوا کا مزاج رکھتے ہو'
مگر یہ کیا، کہ ذرا دیر کو رُکے بھی نہیں!

اندیشہ ہائے دُور دراز

اُداس شام دریچوں میں مسکراتی ہے
ہَوا بھی، دھیمے سُروں میں کوئی اُداس سا گیت
مرے قریب سے گزرے، تو گنگناتی ہے
مری طرح سے شفق بھی کسی کی سوچ میں ہے
میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوں
مری نگاہ دُھندلکوں میں اُلجھی جاتی ہے
نہ رنگ ہے، نہ کرن ہے، نہ روشنی، نہ چراغ
نہ تیرا ذکر، نہ تیرا پتہ، نہ تیرا سُراغ
ہوا سے خشک کتابوں کے اُڑ رہے ہیں ورق
مگر میں بھُول چکی ہوں تمام ان کے سبق

اُبھر رہا ہے تخیل میں بس ترا چہرہ
میں اپنی پلکیں جھپکتی ہوں اس کو دیکھتی ہوں
میں اس کو دیکھتی ہوں اور ڈر کے سوچتی ہوں
کہ کل یہ چہرہ کسی اور ہاتھ میں پہنچے
تو میرے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کوئی تحریر
جو ان خطوط میں روشن ہے آگ کی مانند
نہ ان ذہین نگاہوں کی زد میں آجائے!

اپنی رُسوائی، ترے نام کا چرچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں

نیند آ جائے تو کیا محفلیں برپا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تو تنہائی کا صحرا دیکھوں

شام بھی ہو گئی، دُھندلا گئیں آنکھیں بھی مری
بھُولنے والے، میں کب تک ترا رستا دیکھوں

ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں

کاش صندل سے مری مانگ اُجالے آ کر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ، جو اپنا دیکھوں

تُو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات!
جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکتا دیکھوں

بند کر کے مری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسے
بُوجھے جانے کا میں ہر روز تماشا دیکھوں

سب ضدیں اُس کی میں پوری کروں ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح سے اُسے ہنستا دیکھوں

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اِسی رُت میں مہکتا دیکھوں

پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھِل جائے
پنکھڑی پنکھڑی اُن ہونٹوں کا سایا دیکھوں

میں نے جس لمحے کو پوجا ہے، اُسے بس اِک بار
خواب بن کر تری آنکھوں میں اُترتا دیکھوں

تو مری طرح سے یکتا ہے، مگر میرے حبیب!
جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

ٹوٹ جائیں کہ پگھل جائیں مرے کچے گھڑے
تجھ کو میں دیکھوں کہ یہ آگ کا دریا دیکھوں

پیشکش

اتنے اچھے موسم میں
رُوٹھنا نہیں اچھا
ہار جیت کی باتیں
کل پہ ہم اُٹھا رکھیں
آج دوستی کر لیں!

سکوں بھی خواب ہوا، نیند بھی ہے کم کم پھر
قریب آنے لگا دُوریوں کا موسم پھر

بنا رہی ہے تری یاد مجھ کو سلکِ گہر
پرو گئی مری پلکوں میں آج شبنم پھر

وہ نرم لہجے میں کچھ کہہ رہا ہے پھر مجھ سے
چھڑا ہے پیار کے کومل سُروں میں مدھم پھر

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
اُلجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

نہ اس کی بات میں سمجھوں نہ وہ مری نظریں
معاملاتِ زباں ہو چلے ہیں مبہم پھر

یہ آنے والا نیا دُکھ بھی اس کے سر ہی گیا
چٹخ گیا مری انگشتری کا نیلم پھر

وہ ایک لمحہ کہ جب سارے رنگ ایک ہوئے
کسی بہار نے دیکھا نہ ایسا سنگم پھر

بہت عزیز ہیں آنکھیں مری اُسے لیکن
وہ جاتے جاتے انہیں کر گیا ہے پُرنم پھر

چارہ گر، ہار گیا ہو جیسے
اب تو مرنا ہی دوا ہو جیسے

مجھ سے بچھڑا تھا وہ پہلے بھی مگر
اب کے یہ زخم نیا ہو جیسے

میرے ماتھے پہ ترے پیار کا ہاتھ
رُوح پر دستِ صبا ہو جیسے

یوں بہت ہنس کے مِلا تھا لیکن
دل ہی دل میں وہ خفا ہو جیسے

سر چھپائیں تو بدن کُھلتا ہے
زیست مفلس کی ردا ہو جیسے

اِتنا معلوم ہے!

اپنے بستر پہ بہت دیر سے میں نیم دراز
سوچتی تھی کہ وہ اس وقت کہاں پر ہو گا
میں یہاں ہوں مگر اُس کوچۂ رنگ و بو میں
روز کی طرح سے وہ آج بھی آیا ہو گا
اور جب اُس نے وہاں مجھ کو نہ پایا ہو گا ۔ ! ؟

آپ کو علم ہے، وہ آج نہیں آئی ہیں ؟
میری ہر دوست سے اُس نے یہی پُوچھا ہو گا
کیوں نہیں آئی وہ ۔ کیا بات ہوئی ہے آخر
خود سے اس بات پہ سو بار وہ اُلجھا ہو گا
کل وہ آئے گی تو میں اس سے نہیں بولوں گا
آپ ہی آپ کئی بار وہ رُوٹھا ہو گا
وہ نہیں ہے تو بلندی کا سفر کتنا کٹھن
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس نے یہ سوچا ہو گا

راہداری میں ہرے لان میں پھولوں کے قریب
اُس نے ہر سمت مجھے آن کے ڈھونڈا ہو گا

نام بھُولے سے جو میرا کہیں آیا ہو گا
غیر محسوس طریقے سے وہ چونکا ہو گا
ایک جملے کو کئی بار سنایا ہو گا
بات کرتے ہُوئے سو بار وہ بھُولا ہو گا
یہ جو لڑکی نئی آئی ہے، کہیں وہ تو نہیں
اُس نے ہر چہرہ یہی سوچ کے دیکھا ہو گا
جانِ محفل ہے، مگر آج، فقط میرے بغیر
ہائے کس درجہ وہی بزم میں تنہا ہو گا
کبھی سناٹوں سے وحشت جو ہوئی ہو گی اُسے
اُس نے بے ساختہ پھر مجھ کو پکارا ہو گا
چلتے چلتے کوئی مانوس سی آہٹ پا کر
دوستوں کو بھی کسی عذر سے روکا ہو گا
یاد کر کے مجھے نم ہو گئی ہوں گی پلکیں
"آنکھ میں پڑ گیا کچھ" کہہ کے یہ ٹالا ہو گا

اور گھبرا کے کتابوں میں جو لی ہو گی پناہ
ہر سطر میں مرا چہرہ اُبھر آیا ہو گا
جب ملی ہو گی اسے میری علالت کی خبر
اُس نے آہستہ سے دیوار کو تھاما ہو گا
سوچ کر یہ، کہ بہل جائے پریشانیٔ دِل
یونہی بے وجہ، کسی شخص کو روکا ہو گا!

اتفاقاً مجھے اُس شام مری دوست ملی
میں نے پوچھا کہ سنو — آئے تھے وہ؟ کیسے تھے؟
مجھ کو پُوچھا تھا — ؟ مجھے ڈھونڈا تھا چاروں جانب؟
— اُس نے اِک لمحے کو دیکھا مجھے اور پھر ہنس دی
اس ہنسی میں تو وہ تلخی تھی کہ اس سے آگے
کیا کہا اُس نے — مجھے یاد نہیں ہے — لیکن
اتنا معلوم ہے، خوابوں کا بھرم ٹوٹ گیا!

ایک شعر

تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے اُلجھ جاتی ہیں

خلش

عجیب طرزِ ملاقات اب کے بار رہی
تمہی تھے بدلے ہوئے یا مری نگاہیں تھیں!

تمہاری نظروں سے لگتا تھا جیسے میری بجائے
تمہارے گھر میں کوئی اور شخص آیا ہے
تمہارے عہدے کی دینے تمہیں مبارکباد
سو تم نے میرا سواگت اسی طرح سے کیا
جو افسرانِ حکومت کے ایٹی کیٹ میں ہے!

تکلفاً مرے نزدیک آ کے بیٹھ گئے
پھر اہتمام سے موسم کا ذکر چھیڑ دیا
کچھ اس کے بعد سیاست کی بات بھی نکلی

ادب پہ بھی کوئی دو چار تبصرے فرمائے
مگر نہ تم نے ہمیشہ کی طرح یہ پوچھا
کہ وقت کیسا گزرتا ہے تیرا، جانِ حیات !
پہاڑ دن کی اذیّت میں کتنی شدت ہے
اُجاڑ رات کی تنہائی کیا قیامت ہے!
شبوں کی سُست روی کا تجھے بھی شکوہ ہے ؟
غمِ فراق کے قِصّے، نشاطِ وصل کا ذکر
روایتاً ہی سہی، کوئی بات تو کرتے!

آنے والی کل کا دُکھ

مِری نظر میں اُبھر رہا ہے
وہ ایک لمحہ
کہ جب کسی کی حسین زلفوں کی نرم چھاؤں میں آنکھ مُوندے
گئے دنوں کا خیال کرکے
تم ایک لمحے کو کھو سے جاؤ گے اور شاید
نہ چاہ کر بھی اُداس ہوگے
تو کوئی شیریں نوا یہ پوچھے گی —
"میری جاں! تم کو کیا ہُوا ہے؟
یہ کس تصوّر میں کھو گئے ہو؟"
تمہارے ہونٹوں پہ صبح کی اوّلیں کرن کی طرح سے اُبھرے گی مسکراہٹ
تم اُس کے رُخسار تھپتھپا کے
کہوگے اُس سے —

"میں ایک لڑکی کو سوچتا تھا
عجیب لڑکی تھی ۔ کتنی پاگل !"

تمہاری ساتھی کی خوبصورت جبیں پہ کوئی شکن بنے گی
تو تم بڑے پیار سے ہنسو گے
کہو گے اُس سے ۔
"ارے وہ لڑکی
وہ میرے جذبات کی حماقت
وہ اس قدر بے وقوف لڑکی
مرے لیے کب کی مر چکی ہے !"

پھر اپنی ساتھی کی نرم زلفوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہُوئے تم
کہو گے اُس سے ۔
چلو، نئے آنے والی کل میں
ہم اپنے ماضی کو دفن کر دیں

شرط

ترا کہنا ہے ــــ
"مجھ کو خالقِ کون و مکاں نے
کتنی ڈھیروں نعمتیں دی ہیں
مری آنکھوں میں گہری شام کا دامن کشاں جادو
مری باتوں میں اُجلے موسموں کی گُل فشاں خوشبو
مرے لہجے کی نرمی موجۂ گُل نے تراشی ہے
مرے الفاظ پر قوسِ قزح کی رنگ پاشی ہے
مرے ہونٹوں میں ڈیزی کے گلابی پھول کی رنگت
مرے رخسار پر گلنار شاموں کی جواں حدّت
مرے ہاتھوں میں پنکھڑیوں کی شبنم لمس نرمی ہے
مرے بالوں میں برساتوں کی راتیں اپنا رستہ بھول جاتی ہیں
میں جب دھیمے سُروں میں گیت گاتی ہوں
تو ساحل کی ہوائیں

ادھ کھلے ہونٹوں میں، پیا سے گیت لے کر
سایۂ گُل میں سمٹ کر بیٹھ جاتی ہیں
مرا فن سوچ کو تصویر دیتا ہے
میں حرفوں کو نیا چہرہ
تو چہروں کو حروفِ نو کا رشتہ نذر کرتی ہوں
زباں تخلیق کرتی ہوں"

ترا کہنا مجھے تسلیم ہے
میں مانتی ہوں
اُس نے میری ذات کو بے حد نوازا ہے
خدائے برگ و گُل کے سامنے
میں بھی دُعا میں ہوں، سراپا شکر ہوں
اُس نے مجھے اتنا بہت کچھ دے دیا — لیکن
تجھے دے دے تو میں جانوں!

بس اِتنا یاد ہے

دُعا تو جانے کون سی تھی
ذہن میں نہیں
بس اِتنا یاد ہے
کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں
جن میں ایک میری تھی
اور اک تمہاری !

وہ جب سے شہرِ خرابات کو روانہ ہُوا
براہِ راست ملاقات کو زمانہ ہُوا
وہ شہر چھوڑ کے جانا تو کب سے چاہتا تھا
یہ نوکری کا بُلاوا تو اک بہانہ ہُوا
خُدا کرے تری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
یہ آنکھیں جن کو کبھی دُکھ کا حوصلہ نہ ہُوا
کنارِ صحنِ چمن سبز بیل کے نیچے
وہ روز صبح کا ملنا تو اب فسانہ ہُوا
میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کمی تھی کس شے کی
کہ سب کا ہو کے رہا وہ، بس اک مرا نہ ہُوا
کسے بُلاتی ہیں آنگن کی چمپئی شامیں
کہ وہ اب اپنے نئے گھر میں بھی پرانا ہُوا
دھنک کے رنگ میں ساری تو رنگ لی میں نے
اور اب یہ دُکھ، کہ پہن کر کسے دکھانا ہُوا

میں اپنے کانوں میں بیلے کے پھول کیوں پہنوں
زبانِ رنگ سے کس کو مجھے بُلانا ہُوا

پھر مرے شہر سے گزرا ہے وہ بادل کی طرح
دستِ گُل پھیلا ہُوا ہے مرے آنچل کی طرح

کہہ رہا ہے کسی موسم کی کہانی اب تک
جسم برسات میں بھیگے ہُوئے جنگل کی طرح

اونچی آواز میں اُس نے تو کبھی بات نہ کی
خفگیوں میں بھی وہ لہجہ رہا کومل کی طرح

مِل کے اُس شخص سے میں لاکھ خموشی سے چلوں
بول اُٹھتی ہے نظر، پاؤں کی چھاگل کی طرح

پاس جب تک وہ رہے، درد تھما رہتا ہے
پھیلتا جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح

اب کسی طور سے گھر جانے کی صورت ہی نہیں
راستے میرے لیے ہو گئے دلدل کی طرح

جسم کے تیرہ و آسیب زدہ مندر میں
دل سرِ شام سُلگ اُٹھتا ہے صندل کی طرح

مری دُعا ترے رخشِ صبا خرام کے نام

OH HAPPY HORSE TO BEAR THE WEIGHT OF ANTONY !
DO BRAVELY, HORSE, FOR WOTT'ST THOU WHOM THOU MOVEST?
THE DEMI - ATLAS OF THIS EARTH, THE ARM
AND BURGONET OF MEN [ANTONY & CLEOPATRA
Scene V Act I
Shakespeare]

مری دعا ترے رخشِ صبا خرام کے نام!

ہوا کے ہاتھ نے یہ پیام بھی پہنچے
کہ میں نے اپنی محبت سپرد کی ہے تجھے
سو دیکھ! میری امانت سنبھال کے رکھنا
اسے بہار کی نرماہٹوں نے پالا ہے
سو اس کو گرم ہوا سے بہت بچا رکھنا
یہ گل عذار نہیں آشنائے سختیِ گل
یہ ساتھ ہو تو بہت احتیاط سے چلنا
مزاج اس کا ہواؤں کی طرح سرکش ہے
سو اس کی جنبشِ ابرو کو دیکھتے رہنا
نہیں، یہ سننے کا عادی نہیں رہا ہے کبھی
سو اس کی بات وہ کیسی ہو، مانتے رہنا

اطاعت اس کی بہرگام اب ہے تیرا کام!

ہَوا کے ساتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ خوش نصیب ہے تو اس کا ہمسفر ٹھہرا
میں تیرہ بخت تھی' اس سے بچھڑ گئی کب کی
بھٹک رہی ہوں گھنے جنگلوں میں اب تنہا
تو اس کے لمس سے ہر روز زندگی پائے
میں اُس کے ہجر میں ہر رات لمسِ مرگ چکھوں
ترے گلے میں وہ ہر روز بانہیں ڈالتا ہے
مرے بدن کو وہ حلقہ مگر نصیب نہیں
وہ تیرے جسم سے کتنا قریب ہوتا ہے
مگر میں اُس کے بدن کی مہک کہاں ڈھونڈوں
کہ اُس کے شہر کی پاگل ہوائیں — میرے گھر
نجانے کون سی گلیوں سے ہو کے آتی ہیں
کہ وہ مہک کہیں رستے میں چھوٹ جاتی ہے
اُسی کی یاد میں ہوتی ہے اب تو صبح و شام

ہَوا کے ہاتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ تیری عمر خدائے ازل دراز کرے
جو خواب بھی تری آنکھوں میں ہو' وہ پورا ہو

کہ تیرے ساتھ نے اُس کو بہت خوشی دی ہے
وہ اپنے سارے رفیقوں میں سربلند ہُوا!
شکستہ دل تھا مگر آج ارجمند ہُوا
غریبِ شہر کو جینے کا آسرا تو دیا
بہت اُداس تھا، تو نے اُسے ہنسا تو دیا
(میں کس زباں میں، بتا، تجھ کو شکریہ لکھوں؟)
دعا یہ ہے کہ تجھے ہر خوشی میسّر ہو
اسی طرح سے کبھی تُو بھی سر اُٹھا کے چلے
کبھی تجھے بھی کوئی بھیجے تہنیت کا پیام!

ہوا کے ساتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ اپنے آقا کے ہمراہ سیر کو نکلے
تو اسپِ تازی، کسی دن زقند ایسی بھرے
کہ اُڑ کے میرے نگر، میرے شہر آ پہنچے
تمام عمر دعائیں رہیں گی اس کے نام!

خوشبو کی زباں

زبانِ غیر میں لکھا ہے تو نے خط مجھ کو
بہت عجیب عبارت ۔ بڑی ادق تحریر
یہ سارے حرف مری حدِ فہم سے باہر
میں ایک لفظ بھی محسوس کر نہیں سکتی
میں ہفت خواں تو کبھی بھی نہ تھی ۔ مگر اس وقت
یہ صوت و رنگ، یہ آہنگ اجنبی ہی سہی
مجھے یہ لگتا ہے جیسے میں جانتی ہوں انہیں
(ازل سے میری سماعت ہے آشنا ان سے!)
کہ تیری سوچ کی قربت نصیب ہے اِن کو
یہ وہ زباں ہے جسے تیرا لمس حاصل ہے
ترے قلم نے بڑے پیار سے لکھا ہے انہیں
رچی ہوئی ہے ہر اک لفظ میں تری خوشبو
تری وفا کی مہک، تیرے پیار کی خوشبو
زباں کوئی بھی ہو خوشبو کی ۔ وہ بھلی ہو گی!

تمام رات میرے گھر کا ایک در کھلا رہا
میں راہ دیکھتی رہی، وہ راستہ بدل گیا

وہ شہر ہے کہ جادوگرنیوں کا کوئی دیس ہے
وہاں تو جو گیا کبھی بھی لوٹ کر نہ آ سکا

میں وجہِ ترکِ دوستی کو سن کے مسکرائی تو
وہ چونک اٹھا، عجب نظر سے مجھ کو دیکھنے لگا

بچھڑ کے مجھ سے خلق کو عزیز ہو گیا ہے تو
مجھے تو جو کوئی ملا، تجھی کو پوچھتا رہا

وہ دلنواز لمحے بھی گئی رتوں میں آئے جب
میں خواب دیکھتی رہی، وہ مجھ کو دیکھتا رہا!

وہ جس کی ایک پل کی بے رخی بھی دل کو بار تھی
اُسے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے مجھ کو بھول جا

دمک رہا ہے ایک چاند سا جبیں پہ اب تلک
گریز پا محبتوں کا کوئی پل ٹھہر گیا!

اُس کے مسیحا کے لیے ایک نظم

اجنبی !
کبھی زندگی میں اگر تو اکیلا ہو
اور درد حد سے گزر جائے
آنکھیں تری
بات بے بات رو رو پڑیں
تب کوئی اجنبی
تیری تنہائی کے چاند کا نرم ہالہ بنے
تیری قامت کا سایہ بنے
تیرے زخموں پہ مرہم رکھے
تیری پلکوں سے شبنم چُنے
تیرے دُکھ کا مسیحا بنے !

تشکّر

دشتِ غربت میں جس پیڑ نے
میرے تنہا مسافر کی خاطر گھنی چھاؤں پھیلائی ہے
اُس کی شادابیوں کے لیے
میری سب اُنگلیاں —
ہَوا میں دُعا لکھ رہی ہیں !

وہ عکسِ موجۂ گل تھا، چمن چمن میں رہا
وہ رنگ رنگ میں اُترا، کرن کرن میں رہا

وہ نام حاصلِ فن ہو کے میرے فن میں رہا
کہ رُوح بن کے مری سوچ کے بدن میں رہا

سکونِ دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل، کہ سدا اُس کی انجمن میں رہا

وہ شہر والوں کے آگے کہیں مہذّب تھا
وہ ایک شخص جو شہروں سے دُور بن میں رہا

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجیب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا !

ایک شعر

میں جب بھی چاہوں، اُسے چھُو کے دیکھ سکتی ہوں
مگر وہ شخص کہ لگتا ہے اب بھی خواب ایسا !

دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ
حیرت ہے مجھے، آج کدھر بھول پڑے وہ

بھولا نہیں دل، ہجر کے لمحات کڑے وہ
راتیں تو بڑی تھیں ہی، مگر دن بھی بڑے وہ!

کیوں جان پہ بن آئی ہے، بگڑا ہے اگر وہ
اُس کی تو یہ عادت کہ ہواؤں سے لڑے وہ

الفاظ تھے اُس کے کہ بہاروں کے پیامات
خوشبو سی برسنے لگی، یوں پھول جھڑے وہ

ہر شخص مجھے، تجھ سے جُدا کرنے کا خواہاں
سُن پائے اگر ایک تو دس جا کے جڑے وہ!

بچّے کی طرح چاند کو چھُونے کی تمنّا
دل کو کوئی شہ دے دے تو کیا کیا نہ اڑے وہ

طوفاں ہے تو کیا غم، مجھے آواز تو دیجے
کیا بھول گئے آپ مرے کچے گھڑے وہ!

ویسٹ لینڈ

ایلیٹ کی مشہور نظم (WASTE LAND) سے متاثر ہو کر

ترے بغیر سرد موسموں کے خوشگوار دن اُداس ہیں
فضا میں دُکھ رچا ہوا ہے !
ہوا کوئی اُداس گیت گنگنا رہی ہے
پھول کے لبوں پہ پیاس ہے
ایسا لگتا ہے
ہَوا کی آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی ہوں
صبا کے دونوں ہاتھ خالی ہیں
کہ شہر میں ترا کہیں پتہ نہیں
سانس لینا کس قدر محال ہے !
اُداسیاں — اُداسیاں

تمام سبز سایہ دار پیڑوں نے
ترے بغیر وحشتوں میں اپنے پیرہن کو تار تار کر دیا ہے
اب کسی شجر کے جسم پر قبا نہیں
سوکھے زرد پتّے
کُو بہ کُو تری تلاش میں بھٹک رہے ہیں
اُداسیاں — اُداسیاں !
مرے دریچوں میں گلابی دُھوپ روز جھانکتی ہے
مگر اب اس کی آنکھوں میں
وہ جگمگاہٹیں نہیں
جو تیرے وقت میں زمین کے صبیح ماتھے پر
سورجوں کی کہکشاں سجانے آتی تھیں
زمین بھی مری طرح ہے !
ترے بغیر اس کی کوکھ سے بھی اب
کوئی گلاب اُگ نہ پائے گا
زمین بانجھ ہو گئی ہے
اور میری روح کی بہار آفرین کوکھ بھی !
میری سوچ کے صدف میں

فن کے سچے موتی کس طرح جنم لیا کریں
کہ میں سراپا تشنگی ہوں
اور دُور دُور تک — وصالِ ابر کی خبر نہیں !

میرے اور تیرے درمیان
پانچ پانیوں کے دیس ہیں
(کچے گھڑے بھی تو میری دسترس سے دُور ہیں)
میں شعر کس طرح کہوں
میری سوچ کے بدن کو، 'تُو'، نمو تو دے
میں ترے بغیر "ویسٹ لینڈ" ہوں !

موسم کی دُعا

پھر ڈسنے لگی ہیں سانپ راتیں
برساتی ہیں آگ پھر ہوائیں
پھیلا دے کسی شکستہ تن پر
بادل کی طرح سے اپنی بانہیں!

یہ غنیمت ہے کہ اُن آنکھوں نے پہچانا ہمیں
کوئی تو سمجھا دیارِ غیر میں اپنا ہمیں

وہ کہ جن کے ہاتھ میں تقدیرِ فصلِ گُل رہی
دے گئے سُوکھے ہُوئے پتّوں کا نذرانہ ہمیں

وصل میں تیرے خرابے بھی لگیں گھر کی طرح
اور تیرے ہجر میں بستی بھی ویرانہ ہمیں

سچ تمہارے سارے کڑوے تھے مگر اچھے لگے
پھانس بن کر رہ گیا بس ایک افسانہ ہمیں

اجنبی لوگوں میں ہو تم اور اتنی دُور ہو
ایک اُلجھن سی رہا کرتی ہے روزانہ ہمیں

ق

سُنتے ہیں قیمت تمہاری لگ رہی ہے آج کل
سب سے اچھے دام کس کے ہیں یہ بتلانا ہمیں

تاکہ اُس خوش بخت تاجر کو مبارک باد دیں
(اور اُس کے بعد دل کو بھی ہے سمجھانا ہمیں)

صِرف ایک لڑکی

اپنے سرد کمرے میں
میں اُداس بیٹھی ہوں
نیم وا دریچوں سے
نم ہوائیں آتی ہیں
میرے جسم کو چھو کر
آگ سی لگاتی ہیں
تیرا نام لے لے کر
مجھ کو گدگداتی ہیں

کاش میرے پر ہوتے
تیرے پاس اُڑ آتی
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چھو کے لوٹ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگ دل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں!

لمحاتِ وصل کیسے حجابوں میں کٹ گئے
وہ ہاتھ بڑھ نہ پائے کہ گھونگھٹ سمٹ گئے

خوشبو تو سانس لینے کو ٹھہری تھی راہ میں
ہم بدگمان ایسے کہ گھر کو پلٹ گئے

ملنا — دوبارہ ملنے کا وعدہ — جُدائیاں
اتنے بہت سے کام اچانک نمٹ گئے

روئی ہوں آج کُھل کے بڑی مدتوں کے بعد
بادل جو آسمان پہ چھائے تھے، چھٹ گئے

کس دھیان سے پرانی کتابیں کُھلی تھیں کل
آئی ہوا تو کتنے ورق ہی اُلٹ گئے

شہرِ وفا میں دُھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

اتنی جسارتیں تو اُسی کو نصیب تھیں
جھونکے ہَوا کے کیسے گلے سے لپٹ گئے

دستِ ہوا نے جیسے درانتی سنبھال لی
اب کے سروں کی فصل سے کھلیان پٹ گئے

توقّع

جب ہوا
دھیمے لہجوں میں کچھ گنگناتی ہوئی
خوابِ آسا، سماعت کو چھُو جائے، تو
کیا تمہیں کوئی گزری ہوئی بات یاد آئے گی ؟

ٹوٹی ہے میری نیند مگر، تم کو اس سے کیا!
بجتے رہیں ہواؤں سے در، تم کو اس سے کیا!

تم موج موج مثلِ صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر، تم کو اس سے کیا

اوروں کا ہاتھ تھامو، انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر، تم کو اس سے کیا

ابرِ گریز پا کو برسنے سے کیا غرض
سیپی میں بن نہ پائے گہر، تم کو اس سے کیا!

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر، تم کو اس سے کیا

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر، تم کو اس سے کیا!

چاند رات

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا!
فضا میں کیٹس کے لہجے کی نرماہٹ تھی
موسم اپنے رنگ میں فیضؔ کا مصرعہ تھا
دُعا کے بے آواز ، اُلوہی لمحوں میں
وہ لمحہ بھی کتنا دلکش لمحہ تھا
ہاتھ اُٹھا کر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں
اُس نے مجھ کو اپنے رب سے مانگا تھا
پھر میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر
کتنے پیار سے میرا ماتھا چُوما تھا!

ہَوا ! کچھ آج کی شب کا بھی احوال سُنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج اکیلا تھا ؟
یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی' اور اُس نے
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا؟

....

مقدّر

میں وہ لڑکی ہوں
جس کو پہلی رات
کوئی گھونگھٹ اُٹھا کے یہ کہہ دے
میرا سب کچھ ترا ہے، دل کے سوا!

ایک شعر

لو! میں آنکھیں بند کیے لیتی ہوں اب تم رخصت ہو
دل تو جانے کیا کہتا ہے، لیکن دل کا کہنا کیا!

چراغِ راہ بُجھا کیا، کہ رہنما بھی گیا
ہوا کے ساتھ مسافر کا نقشِ پا بھی گیا

میں پھول چُنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہُوئی
وہ شخص آکے مرے شہر سے چلا بھی گیا

بہت عزیز سہی اُس کو میری دلداری
مگر یہ ہے کہ کبھی دل مرا دُکھا بھی گیا

اب اُن دریچوں پہ گہرے دبیز پردے ہیں
وہ تانک جھانک کا معصوم سلسلہ بھی گیا

سب آئے میری عیادت کو، وہ بھی آیا تھا
جو سب گئے تو مرا دردآشنا بھی گیا

یہ غربتیں مری آنکھوں میں کیسی اُتری ہیں
کہ خواب بھی مرے رخصت ہیں، رتجگا بھی گیا

وہی نرم لہجہ

وہی نرم لہجہ
جو اتنا ملائم ہے جیسے
دھنک گیت بن کر سماعت کو چھونے لگی ہو
شفق نرم کومل سُروں میں کوئی پیار کی بات کہنے چلی ہو
کس قدر! ـــ رنگ و آہنگ کا کس قدر خوبصورت سفر!
وہی نرم لہجہ
کبھی اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے باتیں کرے گا
تو ایسا لگے
جیسے ریشم کے جھولے پہ کوئی مدھر گیت ہلکورے لینے لگا ہو!
وہی نرم لہجہ
کسی شوخ لمحے میں اس کی ہنسی بن کے بکھرے
تو ایسا لگے

جیسے قوسِ قزح نے کہیں پاس ہی اپنی پازیب چھنکائی ہو
ہنسی کی وہ رِم جھم !
کہ جیسے بنفشی چمکدار بُوندوں کے گھنگھرو چھنکنے لگے ہوں !

کہ پھر
اس کی آواز کا مَس پا کے
ہواؤں کے ہاتھوں میں ان دیکھے کنگن کھنکنے لگے ہوں !

وہی نرم لہجہ !
مجھے چھیڑنے پر جب آئے تو ایسا لگے
جیسے ساون کی چنچل ہوا
سبز پتّوں کے جھانجھن پہن
سُرخ پھولوں کی پائل بجاتی ہوئی
میرے رخسار کو
گاہے گاہے شرارت سے چھُونے لگے
میں جو دیکھوں پلٹ کے، تو وہ
بھاگ جائے — مگر
دُور پیڑوں میں چھپ کر ہنسے
اور پھر — ننھّے بچّوں کی مانند خوش ہو کے تالی بجانے لگے !

مجھے جان لینا چاہیئے تھا

وہ مجھے اُس وقت ملا
جب پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی
چیری کے درختوں پر اوّلین شگوفے پھوٹ رہے تھے
نوخیز خوشبو سے سارا باغ روشن تھا
بلبل نے بس ابھی چہکنا شروع کیا تھا
اپنے بازوؤں میں لئے
وہ مجھے پھولوں بھری وادی میں
گھومتا رہا
ہم تتلیاں اور جگنو پکڑتے رہے
بارش ایک پیاری دوست کی طرح
ہمارا ہاتھ بٹاتی رہی

جس دن درخت سے پہلا پتّہ گرا
میں اُسے اُٹھانے کے لئے جُھکی
پلٹ کر دیکھا

تو وہ جا چکا تھا !
اب میں ٹوٹے ہوئے پتّوں میں
اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں
مجھے جان لینا چاہیئے تھا
کہ اُس کا اور میرا ساتھ
موسمِ بہار تک ہے !

ملبے پر لکھی گئی ایک نظم

دیمک ہماری نیو میں اُتر چکی تھی
سو میں نے اُسے بُل ڈوزر چلانے کا اختیار دے دیا !
آج میں اپنے ملبے پر بیٹھی
سوچ رہی ہوں
ٹپکتی ہوئی چھت
اور گرتی ہوئی دیواروں نے
کتنے بھیڑیوں کو
مجھ سے دُور رکھا تھا !

پروین قادر آغا

جب میرے سر سے چادر اُتری
تو میرے گھر کی چھت میرے لئے اجنبی ہوگئی
"تم ہمارے لئے مر چکی ہو"
اہل خانہ کی خاموشی نے اعلان کیا
اور میں بابُل کے دروازے سے
دستک دیے بنا
لوٹ آئی
میں نے
(بڑے مان سے)
اپنے پریمی کی طرف دیکھا
مگر اس کی آنکھوں میں برف جم چکی تھی
(جیسے میرے لئے ان جھیلوں میں کنول کبھی کھلے ہی نہ تھے)
اب میں کھُلے آسمان تلے کھڑی تھی
اپنے لال کو سینے سے لگائے
یا اللہ! میں کہاں جاؤں

سر پہ پہاڑ سی رات
چاروں طرف بھیڑیے
اور عورت بُو سونگھتے ہوئے شکاری کتے
"ہمیں گھاس نہ ڈالنے کا نتیجہ" کہتی آنکھیں
"ہمیں موقعہ دو" کہنے والے اشارے
اور چیتھڑے اڑانے والے قہقہے
اور مار دینے والی ہنسی
ٹھٹھے کرتی ہوا
اور فقرے کستی بارش
ہر طرف سے سنگباری!

مجھ میں اور پاگل پن میں
بس ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا
خودکشی بھی میری تاک میں بیٹھی تھی
قریب تھا کہ
میں اُس کے ہاتھ آجاتی
کہ ایک سایہ میری طرف بڑھا
اور میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا
"ہمیں کسی کی پرواہ نہیں
تم جیسی بھی ہو، ہمیں عزیز ہو!"

اُس دن

میں اتنا روئی

کہ دُنیا اگر ایک خالی تال ہوتی

تو میرے آنسوؤں سے بھر جاتی

میرا ملامت بھرا وجود

اُس دن سے آج تک

اُس مہربان سایے کی پناہ میں ہے

خدا

کبھی کبھی

اپنے فرشتوں کو

زمین پر بھی بھیج دیتا ہے !

ہم سب ایک طرح سے ڈاکٹر فاسٹس ہیں

ہم سب ایک طرح سے
ڈاکٹر فاسٹس ہیں
کوئی اپنے شوق کی خاطر
اور کوئی کسی مجبوری سے بلیک میل ہو کر
اپنی رُوح کا سودا کر لیتا ہے
کوئی صرف آنکھیں رہن رکھوا کر
خوابوں کی تجارت شروع کر دیتا ہے
کسی کو سارا ذہن ہی گِروی رکھوانا پڑتا ہے
بس دیکھنا یہ ہے
کہ سکۂ رائج الوقت کیا ہے
سو زندگی کی WALL STREET کا ایک جائزہ یہ کہتا ہے
کہ آجکل قوتِ خرید رکھنے والوں میں
عزتِ نفس بہت مقبول ہے !

پھر وہی فرمان

کلچر کی باگ ڈور
پارٹی ACTIVISTS نے سنبھال لی ہے
اب راگوں کی چُولیں
ترکھان بٹھائیں گے
اور شاعری
کمہاروں کے آوے میں پکا کرے گی
مصوّری کو لوہار کی دھونکنی کی ضرورت ہے
"بہت ہو گئی رجعت پسندی
رابطے کا ہر وسیلہ اب ہمارا ہے
خفیہ یا قومی"
"بیان ادھورا رہ گیا ...."
"تو رہتا رہے"
"مغنیّہ ابھی استھائی پر تھی .....؛"
"کوئی بات نہیں
انترہ ہم خود اُٹھالیں گے"

"لیکن حضور! یک نظر رومانیہ اور چیکوسلواکیہ اور مشرقی جرمنی پر تو ڈالیں
خود قبلہ کا بھی گوربا چوف ..... "
"ہمیں خبر ہے
"مگر ہم GLASNOST کی خرافات میں نہیں پڑنا چاہتے
ہر وہ شخص جو ہماری اجازت کے بغیر
گزشتہ برسوں زندہ رہا
غدّار ہے
اور غدّاری کی سزا موت ہے
اور زندہ بچ جانے والوں کو خبر ہو
کہ وفاداری کے سرٹیفکیٹ پر اب ہمارے دستخط ہوں گے
رستہ کھینچنے کا اختیار ہمیں مل چکا ہے ! "

U-10536

سندھو دریا کی محبّت میں ایک نظم

ہریالی دریا کے دونوں جانب ہوتی ہے
وہ پہاڑوں اور میدانوں میں بہتے ہوئے
پتھروں اور پھولوں سے یکساں سلوک کرتا ہے
مچھلیاں پکڑتے ہوئے
کبھی کسی مچھیرے سے اُس کا ڈومی سائل نہیں مانگتا
بلکہ شکریے کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے
ہوا اور بادل کی طرح مہربان اور بے نیاز
مگر جب اُس کے کناروں پر رہنے والے
اُس کے پانیوں میں نفرتیں ملانے لگیں
اور بچّوں اور پھولوں کو
والیوں اور مالیوں کا شجرہ دیکھ کر
پانی کا پرمٹ جاری کرنے لگیں
اور یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہے
تو تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے

وہی نرم لہجہ!
کہ جس نے میرے زخمِ جاں پر ہمیشہ شگفتہ گلابوں کی شبنم رکھی ہے
بہاروں کے پہلے پرندے کی مانند ہے
جو سدا آنے والے نئے سُکھ کے موسم کا قاصد بنا ہے
اُسی نرم لہجے نے پھر مجھ کو آواز دی ہے!

کہ ایسے موقعوں پر
دریا اپنا جغرافیہ تبدیل کر لیتے ہیں !

میرا خیال ہے
ہمارے لئے
فی الحال ایک موہن جو ڈارو کافی ہے

ہماری مطبوعات

ناول اور افسانے

گردشِ رنگِ چمن	قرۃ العین حیدر	۱۷۵/=
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۲۰۰/=
چاندنی بیگم	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/=
موجِ ہوا پیچاں	ساجدہ زیدی	۶۰/=
آخری آدمی	انتظار حسین	۹۰/=
خواب رو	جوگندر پال	۴۰/=
میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/=
آدھے چاند کی رات	کشمیری لال ذاکر	۷۵/=
اس صدی کا آخری گرہن	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/=
آتے جاتے موسموں کا سچ	ہرچرن چاولہ	۶۰/=
ناروے کے بہترین افسانے	ہرچرن چاولہ	۶۰/=
البم (یادیں افسانے)	ہرچرن چاولہ	۷۵/=
ٹوٹتے بکھرتے لوگ	یوگیش کمار	۶۰/=
بے نام قاتل	یوگیش کمار	۶۰/=
پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی (لندن)	۷۵/=
فسانہ کہیں جسے	عاشور کاظمی (لندن)	۱۵۰/=
یروشلم یروشلم	قیصر تمکین (لندن)	۶۰/=
وہی قتل بھی کرے ہے	حیدر مہدی رضوی (لندن)	۷۵/=
ٹھکانہ	حیات اللہ انصاری	۶۰/=
سنہری پت جھڑ	نثار راہی	۶۰/=
کینچلی	غضنفر	۶۰/=
دو کشتیوں میں سوار	خالد سہیل	۹۰/=
بازگوئی	سُریندر پرکاش	۷۵/=
خالد بن ولید	قاضی عبدالستار	۱۰۰/=
آئینۂ ایام (قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے)	مرتبہ : غیاث الدین	۱۰۰/=
قطب مینار	پیغام آفاقی	۱۰۰/=

شاعری

شاخِ منظر	جمشید سرور (ناروے)	۶۰/=
سنہری آنچ	واجد سحری	۳۰/=
غالب کی رہگذر	واجد سحری	۳۵/=
شوخیٔ تحریر	سید محمد جعفری	۷۵/=
صلاح الدین پرویز کے خطوط	صلاح الدین پرویز	۶۰/=
سبھی رنگ کے ساون	صلاح الدین پرویز	۱۵۰/=
سمن زار : منتخب فارسی اشعار مع ترجمہ	ضیا احمد بدایونی	۱۰۰/=
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	۷۵/=
تازہ ہوا	باقر نقوی (لندن)	۵۰/=
مہر دو نیم	افتخار عارف (لندن)	۶۰/=
صراطِ منزل	عاشور کاظمی (لندن)	۶۰/=
نغمۂ حیات	دھرمیندر ناتھ بھنوت سرمست	۶۰/=
بے نشان	شاہین	۷۵/=
جب زمینوں سے شجر اُگتے ہیں	علی ظہیر	۶۰/=
ذروں سے ستاروں تک	اکبر حیدرآبادی	۱۰۰/=

اسلامیات

ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت	عزیز احمد / جمیل جالبی	۱۲۵/=
ہند و پاک میں اسلامی کلچر	عزیز احمد / جمیل جالبی	۱۵۰/=
رہبرِ کامل	عبدالاحد بٹ	۲۰/=
آخر اسلام ہی کیوں ؟	عبدالاحد بٹ	۴۰/=
مُعلّمِ اعظم (سیرۃ النبی)	منورہ نوری خلیق	۱۰۰/=
غالب اور تصوف	سید محمد مصطفٰے صابری	۶۰/=

Educational Publishing House

3108-GALI AZIZUDDIN VAKIL, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-110 006 (INDIA)

TEL.: 526162/7774965

ISBN 81-86232-17-6

چاند اس دیس میں نکلا کہ نہیں!
جانے وہ آج بھی سویا کہ نہیں!

اے مجھے جاگتا پاتی ہوئی رات
وہ مری نیند سے بہلا کہ نہیں!

بھیڑ میں کھویا ہُوا بچّہ تھا
اُس نے خود کو ابھی ڈھونڈا کہ نہیں!

مجھ کو تکمیل سمجھنے والا
اپنے معیار میں بدلا کہ نہیں!

گنگناتے ہوئے لمحوں میں اُسے
دھیان میرا کبھی آیا کہ نہیں!

بند کمرے میں کبھی میری طرح
شام کے وقت وہ رویا کہ نہیں!

میری خود داری برتنے والے!
تیرا پندار بھی ٹوٹا کہ نہیں!

الوداع ثبت ہُوئی تھی جس پر
اب بھی روشن ہے وہ ماتھا کہ نہیں!

سبز موسم کی خبر دے کے ہوا آئی ہو
کام یہ تب جبر کے، اسیروں کی دُعا آئی ہو

لوٹ آئی ہو وہ شب جس کے گزر جانے پر
گھاٹ سے پائلیں بجنے کی صدا آئی ہو

اسی اُمید میں بہ موجِ ہوا کو چُوما
چھُو کے شاید تِرے پیاروں کی قبا آئی ہو

گیت جتنے لکھے اُن کے لیے اے موجِ صبا!
دل یہی چاہا کہ تو اُن کو سُنا آئی ہو

آہٹیں صرف ہواؤں کی ہی دستک نہ بنیں
اب تو دروازوں پہ مانوس صدا آئی ہو

یوں سرِ عام، کھلے سر میں کہاں تک بیٹھوں
کسی جانب سے تو اب میری ردا آئی ہو

جب بھی برسات کے دن آئے، یہی جی چاہا
دُھوپ کے شہر میں بھی گھر کے گھٹا آئی ہو

تیرے تحفے تو سب اچھے ہیں مگر موجِ بہار!
اب کے میرے لیے خوشبوئے حنا آئی ہو

آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی

آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی !
رات گہری ہے مگر چاند چمکتا ہے ابھی
میرے ماتھے پہ ترا پیار دمکتا ہے ابھی
میری سانسوں میں ترا لمس مہکتا ہے ابھی
میرے سینے میں ترا نام دھڑکتا ہے ابھی
زیست کرنے کو مرے پاس بہت کچھ ہے ابھی

تیری آواز کا جادو ہے ابھی میرے لیے
تیرے ملبوس کی خوشبو ہے ابھی میرے لیے
تیری باہیں ترا پہلو ہے ابھی میرے لیے
سب سے بڑھ کر مری جاں! تو ہے ابھی میرے لیے
زیست کرنے کو مرے پاس بہت کچھ ہے ابھی
آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی !

آج کے بعد مگر رنگِ وفا کیا ہو گا
عشق حیراں ہے سرِ شہرِ صبا کیا ہو گا
میرے قاتل! ترا اندازِ جفا کیا ہو گا!

آج کی شب تو بہت کچھ ہے مگر کل کے لئے
ایک اندیشۂ بے نام ہے اور کچھ بھی نہیں
دیکھنا یہ ہے کہ کل تجھ سے ملاقات کے بعد
رنگِ اُمید کِھلے گا کہ بکھر جائے گا !
وقت پرواز کرے گا کہ ٹھہر جائے گا !
جیت ہو جائے گی یا کھیل بگڑ جائے گا
خواب کا شہر رہے گا کہ اُجڑ جائے گا!

وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں؟

وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں
جنہیں اب تم چاہا کرتے ہو!
تم کہتے تھے
مری آنکھیں اتنی اچھی، اتنی سچی ہیں
اس حُسن اور سچائی کے سوا، دنیا میں کوئی چیز نہیں
کیا اُن آنکھوں کو دیکھ کے بھی
تم فیض کا مصرعہ پڑھتے ہو؟

تم کہتے تھے
مری آنکھوں کی نیلاہٹ اتنی گہری ہے
"مری رُوح اگر اک بار اُتر جائے تو اس کی پور پور نیلم ہو جائے"
مجھے اتنا بتاؤ
آج تمہاری روح کا رنگ پیراہن کیا ہے

کیا وہ آنکھیں بھی سمندر ہیں ؟

یہ کالی بھوری آنکھیں
جن کو دیکھ کے تم کہتے تھے
"یوں لگتا ہے شام نے رات کے ہونٹ پہ اپنے ہونٹ رکھے ہیں"
کیا اُن آنکھوں کے رنگ میں بھی یوں دونوں وقت ملا کرتے ہیں ؟
کیا سورج ڈوبنے کا لمحہ اُن آنکھوں میں بھی ٹھہر گیا
یا وہاں فقط مہتاب ترشتے رہتے ہیں ؟

میری پلکیں
جن کو دیکھ کے تم کہتے تھے
ان کی چھاؤں تمہارے جسم پہ اپنی شبنم پھیلا دے
تو گزرتے خواب کے موسم لوٹ آئیں
کیا وہ پلکیں بھی ایسی ہیں
جنہیں دیکھ کے نیند آجاتی ہو؟

تم کہتے تھے

مری آنکھیں یونہی اچھی ہیں
"ہاں کاجل کی دُھندلائی ہوئی تحریر بھی ہو۔ تو
بات بہت دلکش ہو گی!"
وہ آنکھیں بھی سنگھار تو کرتی ہوں گی
کیا اُن کا کاجل خود ہی مٹ جاتا ہے؟

کبھی یہ بھی ہُوا
کسی لمحے تم سے رُوٹھ کے وہ آنکھیں رو دیں
اور تم نے اپنے ہاتھ سے اُن کے آنسو خشک کیے
پھر جُھک کر اُن کو چُوم لیا
(کیا اُن کو بھی!!)

ردِّ عمل

گئے موسم کے کسی لمحے میں
تُو نے اس طرح پکارا تھا مجھے
جیسے مدّھم کا بہت میٹھا سُر
روح کا کوئی سرا چھُو جائے
جیسے شبنم کا اکیلا موتی
عارضِ برگِ حنا چھُو جائے
جیسے اک موجِ ہوا کی صورت
رات کی رانی سے کچھ رات کہے
جیسے بچپن کی سہیلی میری
شوخ لہجے میں تری بات کہے!

میں نے شرما کے جھکا لیں پلکیں
اک عجب نشّے کے احساس سے میری آنکھیں
خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں
دیر تک خواب کے عالم میں رہی!

تیری آواز کہ اک گونج بنی جس کے ساتھ
روح ان دیکھے جزیروں میں سفر کرتی رہی
کبھی سمٹی، کبھی بکھری، کبھی مدہوش ہوئی
چاند میں، دشت میں، شبنم میں، سمندر میں رہی
نیلمیں، ریشمیں دنیا میں رہی!

آج لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے دیکھا
اُسی لہجے اُسی انداز کے ساتھ
تیرے ہونٹوں پہ کسی اور کا نام!
سوچتی ہوں کہ ترے لہجے کی اس نرمی پہ
جانے اُس لڑکی نے کیا سوچا ہو!
خواب، مہتاب، گلاب اور شبنم
نیل، آکاش، سحاب اور پُونم
چاندنی، رنگ، کرن، نکہت گُل کا موسم
گیت، خوشبو، لبِ جُو، تیرے بدن کا ریشم
یا ترے ساتھ میں، شیزان سے کافی پی کر
تجھ سے اٹھلا کے کہا ہو، کہ میری جان، چلو لے آئیں
روبی جیولرز کے ہاں سے کوئی تازہ نیلم!

تیری ہم رقص کے نام

رقص کرتے ہوئے
جس کے شانوں پہ تُو نے ابھی سر رکھا ہے
کبھی میں بھی اُس کی پناہوں میں تھی
فرق یہ ہے کہ میں
رات سے قبل تنہا ہُوئی
اور تُو صبح تک
اس فریب تحفّظ میں کھوئی رہے گی !

کتھارسس

میرے شانوں پہ سر رکھ کے
آج
کسی کی یاد میں وہ جی بھر کے رو دیا!

ایک شعر

حال پوچھا تھا اُس نے ابھی
اور آنسو رواں ہو گئے !

خیال و خواب ہُوا برگ و بار کا موسم
بچھڑ گیا تری صورت، بہار کا موسم

کئی رُتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم

وہ نرم لہجے میں کچھ تو کہے کہ لوٹ آئے
سماعتوں کی زمیں پر پھوار کا موسم

پیام آیا ہے پھر ایک سرو قامت کا
مرے وجود کو کھینچے ہے دار کا موسم

وہ آگ ہے کہ مری پور پور جلتی ہے
مرے بدن کو ملا ہے چنار کا موسم

رفاقتوں کے نئے خواب خوشنما ہیں مگر
گزر چکا ہے ترے اعتبار کا موسم

ہوا چلی تو نئی بارشیں بھی ساتھ آئیں
زمیں کے چہرے پہ آیا نکھار کا موسم

وہ میرا نام لیے جائے اور میں اس کا نام
لہو میں گونج رہا ہے پکار کا موسم

قدم رکھے مری خوشبو کہ گھر کو لوٹ آئے
کوئی بتائے مجھے کوئے یار کا موسم

وہ روز آ کے مجھے اپنا پیار پہنائے
مرا غرور ہے بیلے کے ہار کا موسم

ترے طریقِ محبت پہ بارہا سوچا
یہ جبر تھا کہ ترے اختیار کا موسم

کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا، لَوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

اُس نے جلتی ہُوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
رُوح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

دل پہ اک طرفہ قیامت کرنا
مسکراتے ہُوئے رُخصت کرنا

اچھی آنکھیں جو ملی ہیں اُس کو
کچھ تو لازم ہُوا وحشت کرنا

جُرم کس کا تھا، سزا کس کو ملی
کیا گئی بات پہ حجّت کرنا

کون چاہے گا تمہیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبّت کرنا

گھر کا دروازہ کھُلا رکھا ہے
وقت مل جائے تو زحمت کرنا!

نیند تو خواب ہو گئی شاید
جنسِ نایاب ہو گئی شاید

اپنے گھر کی طرح وہ لڑکی بھی
نذرِ سیلاب ہو گئی شاید

تجھ کو سوچوں تو روشنی دیکھوں
یادِ مہتاب ہو گئی شاید

ایک مدت سے آنکھ روئی نہیں
جھیل پایاب ہو گئی شاید

ہجر کے پانیوں میں عشق کی ناؤ
کہیں غرقاب ہو گئی شاید

چند لوگوں کی دسترس میں ہے
زیست کمخواب ہو گئی شاید

عذاب اپنے بکھیر دوں کہ مرتسم کر لوں
میں ان سے خود کو ضرب دوں کہ منقسم کر لوں

میں آندھیوں کی مزاج آشنا رہی ہوں مگر
خود اپنے ہاتھ سے کیوں گھر کو منہدم کر لوں

بچھڑنے والوں کے حق میں کوئی دعا کر کے
شکستِ خواب کی ساعت کو محتشم کر لوں

بچاؤ شیشوں کے گھر کا تلاش کر ہی لیا
یہی کہ سنگ بدستوں کو منصرم کر لوں

میں تھک گئی ہوں اس اندر کی خانہ جنگی سے
بدن کو "سامرا" آنکھوں کو "معتصم" کر لوں

مری گلی میں کوئی شہر یار آتا ہے
ملا ہے حکم کہ لہجے کو محترم کر لوں

گرد چہرے پر قبائے خاک تن پر سج گئی
رات کی گم گشتگی جیسے بدن پر سج گئی

جا چکے موسم کی خوشبو، صورتِ تحریرِ گل
یاد کے ملبوس کی اک اک شکن پر سج گئی

میں تو شبنم تھی، ہتھیلی پر تری گم ہو گئی
وہ ستارہ تھی سو تیرے پیرہن پر سج گئی

کچھ تو شہرِ درد کا احوال آنکھوں نے کہا
اور کچھ گلیوں کی سفّاکی تھکن پر سج گئی

چاند

ایک سے مسافر ہیں
ایک سا مقدّر ہے
میں زمین پر تنہا !
اور وہ آسمانوں میں !

فاصلے

پہلے خط روز لکھا کرتے تھے
دوسرے تیسرے، تم فون بھی کر لیتے تھے
اور اب یہ، کہ تمہاری خبریں
صرف اخبار سے مل پاتی ہیں !

ڈیوٹی

"جان !
مجھے افسوس ہے
تم سے ملنے، شاید اس ہفتے بھی نہ آسکوں گا
بڑی اہم مجبوری ہے !"

جان !
تمہاری مجبوری کو
اب تو میں بھی سمجھنے لگی ہوں
شاید اس ہفتے بھی
تمہارے چیف کی بیوی تنہا ہو گی !

سوچوں تو وہ ساتھ چل رہا ہے دیکھوں تو نظر بدل رہا ہے
کیوں بات زباں سے کہہ کے کھوئی دل آج بھی ہاتھ مل رہا ہے
راتوں کے سفر میں وہم سا تھا یہ میں ہوں کہ چاند چل رہا ہے
ہم بھی ترے بعد جی رہے ہیں اور تُو بھی کہیں بہل رہا ہے
سمجھا کے ابھی گئی ہیں سکھیاں اور دل ہے کہ پھر مچل رہا ہے
ہم ہی بُرے ہو گئے — کہ تیرا معیارِ وفا بدل رہا ہے
پہلی سی وہ روشنی نہیں اب
کیا درد کا چاند ڈھل رہا ہے

دعا کا ٹوٹا ہُوا حرف سرد آہ میں ہے
تری جُدائی کا منظر ابھی نگاہ میں ہے

ترے بدلنے کے باوصف تجھ کو چاہا ہے
یہ اعتراف بھی شامل مرے گناہ میں ہے

عذاب دے گا تو پھر مجھ کو خواب بھی دے گا
میں مطمئن ہوں مرا دل تری پناہ میں ہے

بکھر چکا ہے مگر مسکرا کے ملتا ہے
وہ رکھ رکھاؤ ابھی میرے کجکلاہ میں ہے

جسے بہار کے مہمان خالی چھوڑ گئے
وہ اک مکان ابھی تک مکیں کی چاہ میں ہے

یہی وہ دن تھے جب اک دوسرے کو پایا تھا
ہماری سالگرہ ٹھیک اب کے ماہ میں ہے

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد، قتل گاہ میں ہے

آنگنوں میں اُترا ہے، بام و در کا سناٹا
میرے دل پہ چھایا ہے میرے گھر کا سناٹا

رات کی خموشی تو پھر بھی مہرباں نکلی
کتنا جان لیوا ہے دوپہر کا سناٹا

صبح میرے جوڑے کی ہر کلی سلامت تھی
گونجتا تھا خوشبو میں رات بھر کا سناٹا

اپنی دوست کو لے کر تم وہاں گئے ہو گے
مجھ کو پوچھتا ہو گا رہگزر کا سناٹا

خط کو چوم کر اُس نے آنکھ سے لگایا تھا
کُل جواب تھا گویا لمحہ بھر کا سناٹا

تُو نے اُس کی آنکھوں کو غور سے پڑھا قاصد!
کچھ تو کہہ رہا ہو گا اُس نظر کا سناٹا

دوست چڑیوں کے لیے کچھ حرف

(۱)

بھولی چڑیا !
میرے کمرے میں کیا لینے آئی ہے ؟
یہاں تو صرف کتابیں ہیں !
جو تجھ کو تیرے گھر کا نقشہ تو دے سکتی ہیں
لیکن —
تنکے لانے والے ساتھی
اِن کی پہنچ سے باہر ہیں !

(۲)

چڑیا پیاری،
میرے روشن دان سے اپنے تنکے لے جا !
ایسا نہ ہو کہ —
میرے گھر کی ویرانی — کل
تیرے گھر کی آبادی کو کھا جائے !
تجھ پر میری مانگ کا سایہ پڑ جائے !

(۳)

گوریّا !

کیوں روتی ہے ؟

آج تو تیرے گھر میں سُورج ہُوا کا قاصد بنا ہُوا تھا

کرنیں تیرے سب بچّوں کی اُنگلی تھامے رقصاں تھیں

ننھّے پہلی بار ہوا سے گلے ملے تھے

اور ہُوا سے جو اِک بار گلے مل جاتا ہے

وہ گھر واپس کب آتا ہے !

(۴)

سجے سجائے گھر کی تنہا چڑیا !

تیری تارہ سی آنکھوں کی ویرانی میں

پچھم جا بسنے والے شہزادوں کی ماں کا دُکھ ہے

تجھ کو دیکھ کے اپنی ماں کو دیکھ رہی ہوں

سوچ رہی ہوں

ساری مائیں ایک مقدر کیوں لاتی ہیں ؟

گودیں پھولوں والی !

آنگن پھر بھی خالی !

آنکھوں سے میری، کون مرے خواب لے گیا
چشمِ صدف سے گوہرِ نایاب لے گیا

اس شہرِ خوش جمال کو کس کی لگی ہے آہ
کس دل زدہ کا گریۂ خونناب لے گیا

کچھ ناخدا کے فیض سے ساحل بھی دُور تھا
کچھ قسمتوں کے پھیر میں گرداب لے گیا

واں شہر ڈوبتے ہیں، اِدھر بحث کہ اُنہیں
خُم لے گیا ہے یا خمِ محراب لے گیا

کچھ کھوئی کھوئی آنکھیں بھی موجوں کے ساتھ تھیں
شاید اُنہیں بہا کے کوئی خواب لے گیا

طوفانِ ابر و باد میں سب گیت کھو گئے
جھونکا ہَوا کا ہاتھ سے مضراب لے گیا

غیروں کی دشمنی نے نہ مارا، مگر ہمیں
اپنوں کے التفات کا زہراب لے گیا

اے آنکھ! اب تو خواب کی دُنیا سے لوٹ آ
"مژگاں تو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا"

مفاہمت

زندگی کے لئے
اب تمہارا رویہ، اچانک بہت صلح جُو ہو گیا ہے
(سمندر کی سرکش ہواؤں کو
جوئے شبستاں کی آہستہ گامی مبارک!)
یہ اچھا شگن ہے
ہوا کے مقابل
اگر پھول آئے
تو پھر پنکھڑی پنکھڑی
اُجلے بادل کے خوابوں کی صورت بکھر جائے گی
سو ایسے میں، جھکنے میں ہی خیر ہے!
بارشِ سنگ میں
خواب کے شیش محلوں کو کب تک بچائے رکھیں
اتنے ہاتھوں میں پتھر ہیں
کوئی تو لگ جائے گا

اور پھر

گھُپ اندھیرے میں کب تک نظر کرچیاں ان کی ڈھونڈے
کیا یہ بہتر نہ ہوگا
کہ ایسی قیامت سے پہلے ہی
ان شیش محلوں کو ہم
مصلحت کی چمکتی ہوئی ریت میں دفن کردیں
اور پھر خواب بُنتی ہوئی آنکھ سے معذرت کرلیں !
سو تم نے بھی اب
ایک ہاری ہوئی قوم کے رہنما کی طرح
اپنے ہتھیار دشمن کے قدموں میں رکھ کر
نئی دوستی کا لرزتا ہُوا ہاتھ اُس کی طرف پھر بڑھایا ہے
اور — میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے
کہ ہتھیار دینے کی اس رسم میں
کیا کروں
تمہاری چمکدار، متروکہ تلوار کو
بڑھ کے چوموں
کہ اپنے گلے پر رکھوں ؟

شدید دُکھ تھا اگرچہ تری جُدائی کا — سوا ہے رنج ہمیں تیری بے وفائی کا

تجھے بھی ذوق نئے تجربات کا ہو گا — ہمیں بھی شوق تھا کچھ بخت آزمائی کا

جو میرے سر سے دوپٹہ نہ ہٹنے دیتا تھا — اُسے بھی رنج نہیں میری بے ردائی کا

سفر میں رات جو آئی تو ساتھ چھوڑ گئے — جنہوں نے ہاتھ بڑھایا تھا رہنمائی کا

ردا چھنی مرے سر سے، مگر میں کیا کہتی — کٹا ہُوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا

ملے تو ایسے، رگِ جاں کو جیسے چھُو آئے — جُدا ہوئے تو وہی کرب نارسائی کا

میں سچ کو سچ بھی کہوں گی مجھے خبر ہی نہ تھی — تجھے بھی علم نہ تھا میری اس بُرائی کا

کوئی سوال جو پوچھے، تو کیا کہوں اُس سے — بچھڑنے والے! سبب تو بتا جُدائی کا

نہ دے سکا مجھے تعبیر، خواب تو بخشے
میں احترام کروں گی تری بڑائی کا

چراغِ ماہ لیے تجھ کو ڈھونڈتی گھر گھر
تمام رات میں یاقوت چُن رہی تھی مگر
یہ کیا کہ میں تری خوشبو کا صرف ذکر سنوں
تو عکسِ موجۂ گُل ہے تو جسم و جاں میں اتر
ذرا یہ حبس کٹے ، کُھل کے سانس لے پاؤں
کوئی ہوا تو رواں ہو ، صبا ہو یا صرصر
گئے دنوں کے تعاقب میں تتلیوں کی طرح
ترے خیال کے ہمراہ کر رہی ہوں سفر
ٹھہر گئے ہیں قدم ، راستے بھی ختم ہوئے
مسافتیں رگ و پے میں اتر رہی ہیں مگر
میں سوچتی تھی ، ترا قرب کچھ سکوں دے گا
اُداسیاں ہیں کہ کچھ اور بڑھ گئیں مل کر
ترا خیال ، کہ ہے تارِ عنکبوت تمام
مرا وجود ، کہ جیسے کوئی پرانا کھنڈر !

پکنک

سکھیاں میری
کُھلے سمندر بیچ کھڑی ہنستی ہیں
اور میں سب سے دُور، الگ ساحل پر بیٹھی
آتی جاتی لہروں کو گنتی ہوں
یا پھر
گیلی ریت پہ تیرا نام لکھے جاتی ہوں !

سمندر کی بیٹی

وسعتوں سے سدا اُس کا ناتا رہا تھا
کُھلے آسمانوں
کُھلے پانیوں
اور کُھلے بازوؤں سے ہمیشہ محبت رہی تھی
ہوا، آگ، پانی، کرن اور خوشبو
وہ سارے عناصر جو پھیلیں تو ہر دو جہاں اپنی بانہوں میں لے لیں
سدا اُس کے ساتھی رہے تھے
وہ جنگل کی اتھڑ ہوا کی طرح راستوں کے تعین سے آزاد تھی
وہ تو تخلیقِ فطرت تھی
پر خوبصورت سے شوکیس میں قید کر دی گئی تھی
قفسِ رنگ ماحول کے حبس میں سانس روکے ہوئے تھی
کہ اک دم جو تازہ ہوا کی طرح
اک نویدِ سفر آئی — تو

ایک لمحے کو آزاد ہونے کی وحشی تمنّا میں — وہ
ایک بچّے کی صورت مچلنے لگی
شہر سے دُور
ماں کی محبّت کی مانند
بے لوث، بے انتہا مہرباں دوست اُس کے لیے منتظر تھا
— نرم موجیں کھُلے بازوؤں اُس کی جانب بڑھیں
اور وہ بھی ہوا کی طرح بھاگتی ہی گئی
اور پھر چند لمحوں میں دنیا نے دیکھا
سمندر کی بیٹی سمندر کی باہوں میں سمٹی ہوئی تھی !

احساس

گہرے نیلم پانی میں
پھول بدن لہریں لیتے تھے
ہوائے شبنم ہاتھ انہیں چھو جاتے تو
پور پور میں [illegible] تیرنے لگتی تھی
شوخ سی کوئی موج شرارت کرتی تو
نازک جسموں، نازک احساسات کے مالک لوگ
شاخِ گلاب کی صورت کانپ اُٹھتے تھے !

اوپر وسطِ اپریل کا سُورج
انگارے برساتا تھا

ایسی تمازت !
آنکھیں پگھلی جاتی تھیں !
لیکن دل کا پھول کِھلا تھا

جسم کے اندر رات کی رانی مہک رہی تھی
رُوحِ نخبت کی بارش میں بھیگ رہی تھی
گیلی ریت اگرچہ دھوپ کی حدّت پاکر
جسموں کو جھلسانے لگی تھی

پھر بھی سب چہروں پہ لکھا تھا
ریت کے ہر ذرّے کی چبھن میں
فصلِ بہار کے پہلے گلابوں کی ٹھنڈک ہے !

خواب

کُھلے پانیوں میں گھِری لڑکیاں
نرم لہروں کے چھینٹے اُڑاتی ہُوئی
بات بے بات ہنستی ہُوئی
اپنے خوابوں کے شہزادوں کا تذکرہ کر رہی تھیں
جو خاموش تھیں
اُن کی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ کی تحریر تھی
اُن کے ہونٹوں کو بھی اَن کہے خواب کا ذائقہ چُومتا تھا !
(آنے والے نئے موسموں کے سبھی پیرہن نیلمیں ہو چکے تھے !)
دُور ساحل پہ بیٹھی ہُوئی ایک ننھّی سی بچّی
ہماری ہنسی اور موجوں کے آہنگ سے بے خبر
ریت سے ایک ننھّا گھروندا بنانے میں مصروف تھی
اور میں سوچتی تھی
خدایا ! یہ ہم لڑکیاں
کچّی عمروں سے ہی خواب کیوں دیکھنا چاہتی ہیں
(خواب کی حکمرانی میں کتنا تسلسل رہا ہے !)

مشورہ

ننھی لڑکی
ساحل کے اتنے نزدیک
ریت سے اپنے گھر نہ بنا
کوئی سرکش موج اِدھر آئی تو
تیرے گھر کی بنیادیں تک بہہ جائیں گی
اور پھر اُن کی یاد میں تو
ساری عمر اُداس رہے گی !

آنچل اور بادبان

ساحل پر اک تنہا لڑکی
سرد ہوا کے بازو تھامے
گیلی ریت پہ گھوم رہی ہے
جانے کس کو ڈھونڈ رہی ہے
بن کاجل، بیکل آنکھوں سے
کُھلے سمندر کے سینے پر
ذرا ٹھہرتی کشتی کے بادبان کے لہرانے کو
کس حیرت سے دیکھ رہی ہے !
کس حسرت سے اپنا آنچل مَسل رہی ہے !

جان پہچان

شور مچاتی موجِ آب
ساحل سے ٹکرا کے جب واپس لوٹی تو
پاؤں کے نیچے جمی ہوئی چمکیلی سنہری ریت
اچانک سرک گئی !
کچھ کچھ گہرے پانی میں
کھڑی ہوئی لڑکی نے سوچا
یہ لمحہ کتنا جانا پہچانا لگتا ہے !

دل کی ہنسی

وہ لڑکی
جس کے چہرے پر سدا اداسی رہتی تھی
جس کے ہونٹ کبھی اخلاقاً بھی ہنستے تو
یوں لگتا تھا
اک لمحہ بھی اور ہنسے تو
اُس کی آنکھیں رو دیں گی !
جو روزانہ
اپنے وقت پہ کالج آتی
سب سے الگ اپنی دُنیا میں گم رہتی
اپنے کھوئے ہوئے لوگوں کی یاد میں کھوئی رہتی
وہ خاموش اُداس سی لڑکی
میرا کہنا مان کے پکنک پر چل دی
میں نے دیکھا

میری سکھیوں کے ہمراہ
وہ پانی میں بیٹھی ہے
لہروں سے بھی کھیل رہی ہے
جانے کون سی بات ہوئی ہے
سب کے ساتھ وہ ہنس دی ہے

اور اس لمحے
اُس کے ہونٹوں کے ہمراہ
اُس کی آنکھیں بھی ہنستی ہیں !

دوست

اس اکیلی چٹان نے
سمندر کے ہمراہ
تنہائی کا زہر اتنا پیا ہے
کہ اس کا سنہری بدن نیلا پڑنے لگا ہے !

نیند تو خواب ہے اور ہجر کی شب خواب کہاں
اس اماوس کی گھنی رات میں مہتاب کہاں

رنج سہنے کی مرے دل میں تب و تاب کہاں
اور یہ بھی ہے کہ پہلے سے وہ اعصاب کہاں

میں بھنور سے تو نکل آئی ، اور اب سوچتی ہوں
موجِ ساحل نے کیا ہے مجھے غرقاب کہاں

میں نے سونپی تھی تجھے آخری پونجی اپنی
چھوڑ آیا ہے مری ناؤ تہہِ آب کہاں

ہے رواں آگ کا دریا مری شریانوں میں
موت کے بعد بھی ہو پائے گا پایاب کہاں

بند باندھا ہے سروں کا مرے دہقانوں نے
اب مری فصل کو لے جائے گا سیلاب کہاں

گونگے لبوں پہ حرفِ تمنّا کیا مجھے
کس کورِ چشمِ شب میں ستارا کیا مجھے

زخمِ ہنر کو سمجھے ہوئے ہے گلِ ہنر
کس شہرِ ناسپاس میں پیدا کیا مجھے

جب حرف ناشناس یہاں لفظ فہم ہیں
کیوں ذوقِ شعر دے کے تماشا کیا مجھے

خوشبو ہے، چاندنی ہے، لبِ جُو ہے، اور میں
کس بے پناہ رات میں تنہا کیا مجھے

دی تشنگی خدا نے تو چشمے بھی دے دیے
سینے میں دشت، آنکھوں میں دریا کیا مجھے

میں یوں سنبھل گئی کہ تری بے وفائی نے
بے اعتباریوں سے شناسا کیا مجھے

وہ اپنی ایک ذات میں کُل کائنات تھا
دُنیا کے ہر فریب سے ملوا دیا مجھے

ق

اوروں کے ساتھ میرا تعارف بھی جب ہُوا
ہاتھوں میں ہاتھ لے کے وہ سوچا کیا مجھے
بیتے دنوں کا عکس نہ آئندہ کا خیال
بس خالی خالی آنکھوں سے دیکھا کیا مجھے

پسِ جاں

چاند کیا چھپ گیا ہے
گھنے بادلوں کے کنارے
روپہلے ہُوئے جا رہے ہیں !

جستجو کھوئے ہوؤں کی عمر بھر کرتے رہے
چاند کے ہمراہ ہم ہر شب سفر کرتے رہے

راستوں کا علم تھا ہم کو نہ سمتوں کی خبر
شہرِ نا معلوم کی چاہت مگر کرتے رہے

ہم نے خود سے بھی چھپایا اور سارے شہر کو
تیرے جانے کی خبر دیوار و در کرتے رہے

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا، اس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر کرتے رہے

آج آیا ہے ہمیں بھی اُن اُڑانوں کا خیال
جن کو تیرے زعم میں بے بال و پر کرتے رہے

زندگی سے نظر ملاؤ کبھی
ہار کے بعد مسکراؤ کبھی

ترکِ اُلفت کے بعد اُمیدِ وفا
ریت پر چل سکی ہے ناؤ کبھی!

اب جفا کی صراحتیں بیکار
بات سے بھر سکا ہے گھاؤ کبھی

شاخ سے موجِ گُل تھمی ہے کہیں!
ہاتھ سے رُک سکا بہاؤ کبھی

اندھے ذہنوں سے سوچنے والو
حرف میں روشنی ملاؤ کبھی

بارشیں کیا زمیں کے دُکھ بانٹیں!
آنسوؤں سے بُجھا الاؤ کبھی

اپنے اسپین کی خبر رکھنا
کشتیاں تم اگر جلاؤ کبھی!

سمندروں کے اُدھر سے کوئی صدا آئی
دلوں کے بند دریچے کُھلے ہوا آئی

سرک گئے تھے جو آنچل' وہ پھر سنوارے گئے
کُھلے ہُوئے تھے جو سر' اُن پہ پھر ردا آئی

اُتر رہی ہیں عجب خوشبوئیں رگ و پے میں
یہ کس کو چھُو کے مرے شہر میں صبا آئی

اُسے پکارا تو ہونٹوں پہ کوئی نام نہ تھا
محبتوں کے سفر میں عجب فضا آئی

کہیں رہے وہ، مگر خیریت کے ساتھ رہے
اُٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دُعا آئی

ننھّے دوست کے نام ایک نظم

گھنے درختوں کی سبز شاخوں پہ کھلنے والے حسیں شگوفے!
سُنا ہے
تیرے گلاب چہرے کو برفباری کی رُت نے نرگس بنا دیا ہے
سو ننھی کونپل! اُداس مت ہو
کہ تیرے رخسار کی شفق کو
کبھی بھی دستِ شبِ زمستاں نہ چھُونے پائے گا
اس شفق میں محبتوں کا لہُو رواں ہے
عظیم گہری محبتوں کے صدف میں
ابرِ بہار کی پہلی سانس ہے تو
جوان جسموں کی مشترک دھڑکنوں کا پہلا جمیل نغمہ
جوان راتوں کی کوکھ سے پھُوٹتا ہوا پہلا چاند ہے تُو
زمین اور آسماں کے سنگم پہ
زندگی کا نیا اُفق تُو

سوائے مرے ادھ کھلے شگوفے!
تمام سچی محبتوں کے تمام گیتوں کی طرح تو بھی امر رہے گا

وہ لمحہ آواز دے رہا ہے
جب ایسی ویران شاخساروں کے بے نمو جسم پر نئی کونپلیں اُگیں گی
شجر شجر کی برہنگی سبز پوش ہوگی

وہ ساعتیں راستے میں ہیں
جب کہ تیرے کم سِن بدن کی کچّی مہک کو
دستِ بہار کا لمس
وصفِ گویائی دے سکے گا
یہ زرد رُت جلد بیت جائے گی
سبز موسم قریب تر ہے!

شہرِ چارہ گراں

پس شہرِ چارہ گراں
نرم آبی قباؤں میں ملبوس کچھ نوجواں
اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں
مثلِ موجِ صبا' پھر رہے تھے
آنسوؤں کا مداوا
دکھوں کی مسیحائی
زخمِ ہنر کی پذیرائی کرتے ہُوئے
پھول چہرہ' فرشتہ قبا' زندگی رنگ' شبنم زباں' چاندنی لمس' عیسیٰ نفس چارہ گر
مجھ کو بے طرح اچھے لگے
جی یہ چاہا کہ اُن کے لیے کچھ لکھوں
اُن کے چہروں کی یہ مہرباں چاندنی
اُن کی آنکھوں کی یہ نرم دل روشنی
ان کے لہجوں کی غم خوار تابندگی

ان کے ہونٹوں کی دلدار پیاری ہنسی
یوں ہی روشن رہے، جگمگاتی رہے
زندگی ان کے ہمراہ ہنستی رہے !

یہ دعا میرے ہونٹوں پہ لیکن ادھوری رہی
دفعتاً جانے کس سمت سے
ایک انساں کا زخمی بدن آ گیا
خوں میں ڈوبا ہُوا، کرب آلودہ چہرہ
مرے ذہن پر اس طرح چھا گیا
میری پلکوں کی مانند لہجہ بھی نم ہو گیا
گفتگو کی قبا بھی لہُو رنگ ہونے لگی
مگر — جو مسیحا مرے سامنے تھا
کھڑا مسکراتا رہا
سلسلہ اُس کی باتوں کا چلتا رہا
اس کی آنکھوں میں ہلکا سا بھی دُکھ نہ تھا
بلکہ وہ
میری افسردگی دیکھ کر ہنس دیا —

"— بی بی ! اس طرح تو روز ہوتا ہے
کوئی کہاں تک پریشان ہو
کون اوروں کے دُکھ مول لے
روز کی بات ہے
چھوڑیے بھی اسے — آیئں باتیں کریں !"
میری آنکھیں تقدّس کے پیکر کو حیرت سے تکنے لگیں
میں فرشتوں کے پر سے تراشے ہُوئے
نرم آبی لبادے میں ملبوس انسان کو دیکھتی رہ گئی
مجھ کو لوگوں نے سمجھایا— "دیکھو — سنو —
یہ مسیحا ہیں، ان کے لئے موت بھی
عام سا واقعہ ہے، قیامت نہیں !"
چارہ سازی کی منزل مبارک انہیں
پر یہاں تک یہ جس راہ سے آئے ہیں
اس میں ہر موڑ پر
ان کے دل ان کے پیروں تلے آئے ہیں
نرم حسّاس دل کے عوض، چارہ سازی خریدی گئی
اور یہ قیمت بہت ہی بڑی ہے — بہت ہی بڑی !

سحاب تھا کہ ستارہ، گریز پا ہی لگا
وہ اپنی ذات کے ہر رنگ میں ہوا ہی لگا

میں ایسے شخص کی معصومیت پہ کیا لکھوں
جو مجھ کو اپنی خطاؤں میں بھی بھلا ہی لگا

زباں سے چپ ہے مگر آنکھ بات کرتی ہے
نظر اُٹھائی ہے جب بھی تو بولتا ہی لگا

جو خواب دینے پہ قادر تھا، مری نظروں میں
عذاب دیتے ہُوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

نہ میرے لطف پہ حیراں نہ اپنی اُلجھن پر
مجھے یہ شخص تو ہر شخص سے جُدا ہی لگا

زمیں پہ جب کسی نئے وجُود نے جنم لیا

(عالمی یوم اطفال)

زمیں پہ جب کسی نئے وجُود نے جنم لیا
یقین آ گیا
خدا ابھی بشر سے بدگماں نہیں
مگر نئی کلی کا رنگ دیکھ کر
یہ واہمہ بھی جاگ اُٹھا
خدا بہار سے خفا ہے کیا ؟
خدا خفا ہو یا نہ ہو
ہوا ضرور بدگمان ہے !

یہ زرد رُو، دریدہ جاں
یہ پور پور استخواں
اماوسوں کی رات میں نہ لوریاں، نہ پالنا
خزاں کے ہاتھ بچ سکیں نہ شوخیاں نہ بچپنا

نہ ان کا ذہن آگہی کے لمس کا شریک ہے
نہ ان کی آنکھ روشنی کے ذائقے سے آشنا!
ضدوں کا وقت اور خود کو روکنا
شرارتوں کی عمر اور سوچنا!
یہ سر اُٹھائیں کیا، انہیں کسی پہ مان ہی نہیں
کسی کا پیار ان کے حوصلوں کی جان ہی نہیں
ہوائیں خوشبوؤں کے تحفے دلدلوں کے پار لے گئیں
گھٹائیں بارشوں کے سب سندیس ندیوں کو دے گئیں
غزال اب بھی تشنہ کام ہی رہے
ہوا سے صرف نامہ و پیام ہی رہے
وہی ہے تشنگی، وہی رُتوں کی کم نگاہیاں!
وہی اکیلا پن، وہی سمے کی کج ادائیاں!

ہوا میں طائرانِ آہنی کا وصل (گرچہ) خوب ہے
(خلا سے لے کے چاند تک زمیں کہاں غروب ہے؟)
مگر زمیں کے اپنے چاند، آج بھی گہن میں ہیں
جبیں کے داغ کیا دُھلیں، سیاہیاں کرن میں ہیں

صبا نفس حیات کا جمال بے نمو رہا
ہوا گزیدہ پھول کا لباس بے رفو رہا
ہمکتے کھلکھلاتے بچے اب خیال و خواب ہو گئے
ہمارے اگلے
اپنی بے بضاعتی میں کیا عذاب ہو گئے
یہ شب نصیب
جن کو بھوک نے جنم دیا ہے
تشنگی نے دیکھ بھال کی
یہ کھوکھلی جڑیں
نئی رُتوں میں شاخسارِ جاں کو
کیسی کونپلیں عطا کریں گی ؟
(کرسکیں گی ؟ — یہ بھی سوچنے کی بات ہے)
شدید موسموں پہ پلنے والے پیڑ
کتنے اُونچے جائیں گے ؟
یہ بے ثمر درخت
اپنی چھاؤں کتنی دُور لائیں گے ؟
جڑوں کی بانجھ کوکھ میں نہ رنگ ہے، نہ روپ ہے

نظر کی آخری حدوں تلک
فضا میں صرف دُھوپ ہے !

نوادرات، سیم و زر، گئے زمانوں کی کہانیاں بھی
محترم ہیں
ان کو جمع کرنا نیک کام ہے
مگر یہ بچّے زندگی ہیں
میوزیم کے افسران زندگی جمع کریں
اسے پناہ دیں !
اسے نمو دیں !
اسے غرور دیں !

یہ بے اماں — یہ بے مکاں
یہ کم لباس، کم زباں
انہیں بھی راستوں میں نرم چھاؤں کی نوید ہو
ہرے بھرے لباس میں کبھی تو ان کی عید ہو !

تیرا گھر اور میرا جنگل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ
ایسی برساتیں کہ بادل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بچپنے کا ساتھ ہے، پھر ایک سے دونوں کے دُکھ
رات کا اور میرا آنچل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

وہ عجب دُنیا کہ سب خنجر بکف پھرتے ہیں، اور
کانچ کے پیالوں میں صندل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بارشِ سنگِ ملامت میں بھی وہ ہمراہ ہے
میں بھی بھیگوں، خود بھی پاگل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں، سُکھ اُس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بارشیں جاڑے کی اور تنہا بہت میرا کسان
جسم اور اکلوتا کمبل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بجا کہ آنکھ میں نیندوں کے سلسلے بھی نہیں
شکستِ خواب کے اب مجھ میں حوصلے بھی نہیں

نہیں نہیں ! یہ خبر دشمنوں نے دی ہو گی
وہ آئے ! آ کے چلے بھی گئے ! ملے بھی نہیں !

یہ کون لوگ اندھیروں کی بات کرتے ہیں
ابھی تو چاند تری یاد کے ڈھلے بھی نہیں

ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے
ابھی تو چاک مرے زخم کے سِلے بھی نہیں

خفا اگرچہ ہمیشہ ہُوئے مگر اب کے
وہ برہمی ہے کہ ہم سے انہیں گِلے بھی نہیں

بنفشے کا پھول

وہ پتھر پہ کھلتے ہوئے خوبصورت بنفشے کا ننھا سا اک پھول تھی[1]
جس کی سانسوں میں جنگل کی وحشی ہوائیں سمائی ہوئی تھیں
اُس کے بے ساختہ حُسن کو دیکھ کر
اک مسافر بڑے پیار سے توڑ کر، اپنے گھر لے گیا

اور پھر
اپنے دیوان خانے میں رکھّے ہوئے کانچ کے خوبصورت سے گُل دان میں
اُس کو ایسے سجایا
کہ ہر آنے والے کی پہلی نظر اُس پہ پڑنے لگی
داد و تحسین کی بارش میں وہ بھیگتا ہی گیا
کوئی اُس سے کہے
گولڈ لیف اور شینیل کی نرم شہری مہک سے
بنفشے کے ننھّے شگوفے کا دم گھُٹ رہا ہے
وہ جنگل کی تازہ ہوا کو ترسنے لگا ہے!

---

[1] A VIOLET UNDER A HIDDEN ROCK
(WORDSWORTH)

فلاور شو

پھول ہی پھول ہیں
تا بہ حدِ نظر
آتشی، آسمانی، گلابی
کاسنی، چمپئی، ارغوانی
کتنے مشاق ہاتھوں نے ـــ کتنی
یاسمن یاسمن انگلیوں نے
اس طرح سے سجایا، سنوارا انہیں
اور پھر دادِ اہلِ نظر اور تحسینِ چشمِ نگاراں ملی
یہ نہ سوچا کسی نے، کہ گُل نے
شاخ سے ٹوٹ کر
حسن کے اس سفر میں
کس طرح کی اذیت اُٹھائی!

ہم کہ شاعر ہیں ۔ نوکِ قلم سے
فکر کے پھول مہکا رہے ہیں
اپنی سوچوں کی تابندگی سے
عارضِ وقت چمکا رہے ہیں
ایک وقت ایسا بھی آ رہا ہے
جب کہ دیوان اپنے
آبنوس اور مرمر کے شیلفوں میں پتھر کی مانند سج جائیں گے
یاسمن یاسمن انگلیاں
شعر کے لمس سے بے خبر
ان کو ترتیب دیں گی
نرگسی نرگسی کتنی آنکھیں
حسنِ ترتیب کی داد دیں گی
اس حقیقت سے ناآشنا
حسنِ تخلیق کے اس سفر میں
ہم نے کیسی اذیت اٹھائی !

دسترس سے اپنی باہر ہو گئے
جب سے ہم اُن کو میسّر ہو گئے

ہم جو کہلائے طلوعِ ماہتاب
ڈُوبتے سُورج کا منظر ہو گئے

شہرِ خوباں کا یہی دستور ہے
مُڑ کے دیکھا اور پتھّر ہو گئے

بے وطن کہلائے اپنے دیس میں
اپنے گھر میں رہ کے بے گھر ہو گئے

سُکھ تری میراث تھے، تجھ کو ملے
دُکھ ہمارے تھے، مقدّر ہو گئے

وہ سراب اُترا رگ و پے میں کہ ہم
خود فریبی میں سمندر ہو گئے

تیری خود غرضی سے خود کو سوچ کر
آج ہم تیرے برابر ہو گئے

لڑکیاں اُداس ہیں

پھر وہی نرم ہوا
وہی آہستہ سفر موجِ صبا
گھر کے دروازے پہ ننھّی سی ہتھیلی رکھّے
منتظر ہے
کہ کسی سمت سے آواز کی خوشبو آئے
سبز بیلوں کے خنک سائے سے کنگن کی کھنک
سُرخ پھولوں کی سجل چھاؤں سے پائل کی چھنک
کوئی آواز — بنام موسم !
اور پھر موجِ ہوا، موجۂ خوشبو کی وہ البیلی سکھی
کچّی عمروں کے نئے جذبوں کی سرشاری سے پاگل برکھا
دھانی آنچل میں شفق ریز، سلونا چہرہ
کاسنی چُنری، بدن بھیگا ہُوا
پشت پر گیلے، مگر آگ لگاتے گیسو
بھُوری آنکھوں میں دمکتا ہُوا گہرا کجرا
رقص کرتی ہُوئی رم جھم کے مدُھر تال کے زیروبم پر

جھُومتی، نقرئی پازیب بجاتی ہُوئی آنگن میں اُتر آئی ہے
تھام کر ہاتھ یہ کہتی ہے
مرے ساتھ چلو!

لڑکیاں
شیشوں کے شفاف دریچوں پہ گرائے ہُوئے سب پردوں کو
اپنے کمروں میں اکیلی بیٹھی
کیٹس کے "اوڈس" پڑھا کرتی ہیں
کتنا مصروف سکوں چہروں پہ چھایا ہے — مگر
جھانک کے دیکھیں
تو آنکھوں کو نظر آئے، کہ ہر مُوئے بدن
گوش برساز ہے!
ذہن بیتے ہُوئے موسم کی مہک ڈھونڈتا ہے
آنکھ کھوئے ہُوئے خوابوں کا پتہ چاہتی ہے
دل بڑے کرب سے
دروازوں سے ٹکراتے ہُوئے نرم رم جھم کے مدُھر گیت کے اس سُر کو بلانے کی سعی کرتا ہے
جو گئے لمحوں کی بارش میں کہیں ڈوب گیا!

رفاقت

سبز موسم کی بے حد خنک رات تھی
چنبیلی کی خوشبو سے بوجھل ہوا
دھیمے لہجوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی
ریشمیں اوس میں بھیگ کر
رات کا نرم آنچل بدن سے لپٹنے لگا تھا
ہارسنگھار کی نرم خوشبو کا جادو
جواں رات کی سانس میں گھُل رہا تھا
چاندنی، رات کی گود میں سر رکھے ہنس رہی تھی
اور میں سبز موسم کی گلنار ٹھنڈک میں کھوئی ہوئی
شاخ در شاخ
اک تیتری کی طرح اُڑ رہی تھی
کبھی اپنی پرواز میں رُک کے نیچے جو آتی تو احساس ہوتا مجھے
شبنمی گھاس کا لمس پاؤں کو کتنا سکوں دے رہا ہے!
دفعتاً
میں نے ٹی۔وی کی خبروں پہ موسم کی بات سُنا
ترے شہر میں لُو چلی ہے

ایک سو آٹھ سے بھی زیادہ حرارت کا درجہ رہا ہے
مجھے یوں لگا
میرے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے
ہوائیں جہنّم سے آنے لگی ہیں
تمازت سے میرا بدن پُھنک رہا ہے
میں اُس شبنمی رُوح پرور فضا کو جھٹک کر
کچھ اس طرح کمرے میں اپنے چلی آئی
جیسے کہ ایک لمحہ بھی اور رُک جاؤں گی تو جُھلس جاؤں گی !
پھر بڑی دیر تک
تیرے تپتے ہُوئے جسم کو
اپنے آنچل سے جھلتی رہی
تیرے چہرے سے لپٹی ہوئی گرد کو
اپنی پلکوں سے چنتی رہی
رات سونے سے پہلے
اپنی شب خوابیوں کا لبادہ جو پہنا
تو دیکھا
مرے جسم پر آبلے پڑ چکے تھے !

لمحہ لمحہ وقت کی جھیل میں ڈوب گیا
اب پانی میں اُتریں بھی تو پائیں کیا

طوفاں جب آیا تو جھیل میں کُود پڑا
وہ لڑکا جو کشتی کھینے نکلا تھا

کتنی دیر تک اپنا آپ بچائے گی
ننھی سی اک لہر کو موجوں نے گھیرا

اپنے خوابوں کی نازک پتواروں سے
تیر رہا ہے سطحِ آب پہ اک پتّہ

ہلکی ہلکی لہریں نیلم پانی میں
دھیرے دھیرے ڈولے یاقوتی نیّا

شبنم کے رخساروں پر سورج کے ہونٹ
ٹھہر گیا ہے وصل کا ایک روشن لمحہ

چاند اُتر آیا ہے گہرے پانی میں
ذہن کے آئینے میں جیسے عکس ترا

کیسے ان لمحوں میں تیرے پاس آؤں
ساگر گہرا، رات اندھیری، میں تنہا

ٹھہر کے دیکھے تو رُک جائے نبض ساعت کی
شبِ فراق کی قامت ہے کس قیامت کی

وہ رت جگے، وہ گئی رات تک سخن کاری
شبیں گزاری ہیں ہم نے بھی کچھ ریاضت کی

وہ مجھ کو برف کے طوفاں میں کیسے چھوڑ گیا
ہوائے سرد میں بھی جب مری حفاظت کی

سفر میں چاند کا ماتھا جہاں بھی دُھندلایا
تری نگاہ کی زیبائی نے قیادت کی!

ہَوا نے موسمِ باراں سے سازشیں کر لیں
مگر شجر کو خبر ہی نہیں شرارت کی

ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں

"پرل کا نیچرل پنک'
ریولان کا ہینڈ لوشن
الزبتھ آرڈن کا بلش آن بھی'
میڈورا میں پھر نیل پالش کا کوئی نیا شیڈ آیا ؟
مرے اس بنفشی دوپٹے سے ملتی ہوئی
راٹمل میں لپ اسٹک ملے گی ؟
ہاں' وہ ٹیولپ کا شیمپو بھی دیجئے گا
یاد آیا
کچھ روز پہلے جو ٹیوزر لیا تھا، وہ بالکل ہی بیکار نکلا!
دوسرا دیجئے گا !
ذرا بل بنا دیجئے !"

"ارے ! وہ جو کونے میں ایک سینٹ رکھا ہوا ہے

دکھائیں ذرا
اسے ٹسٹ کرکے تو دیکھوں
(خدایا! خدایا!
یہ خوشبو تو اس کی پسندیدہ خوشبو رہی ہے
سدا اس کے ملبوس سے پھوٹتی تھی!)"

"ذرا اس کی قیمت بتادیں!
اِس قدر!!
اچھا، یوں کیجئے
باقی چیزیں کبھی اور لے جاؤں گی
آج تو صرف اس سینٹ کو پیک کردیجئے!"

مسئلہ

"پتھر کی زباں" کی شاعرہ نے
اک محفلِ شعر و شاعری میں
جب نظم سناتے مجھ کو دیکھا
کچھ سوچ کے دل میں مسکرائی!

جب میز پہ ہم ملے تو اُس نے
بڑھ کر مرے ہاتھ ایسے تھامے
جیسے مجھے کھوجتی ہو کب سے
پھر مجھ سے کہا کہ — آج 'پروین'!
جب شعر سناتے تم کو دیکھا
میں خود کو بہت ہی یاد آئی!
وہ وقت، کہ جب تمہاری صورت
میں بھی یونہی شعر کہہ رہی تھی

لکھتی تھی اسی طرح کی نظمیں
پراب تو وہ ساری نظمیں، غزلیں
گزرے ہوئے خواب کی ہیں باتیں!
میں سب کو ڈِس اونؔ کر چکی ہوں!

"پتھر کی زباں" کی شاعرہ کے
چنبیلی سے نرم ہاتھ تھامے
"خوشبو" کی سفیر سوچتی تھی
درپیش ہواؤں کے سفر میں
پل پل کی رفیقِ راہ — میرے
اندر کی یہ سادہ لوح ایلسؔ
حیرت کی جمیل وادیوں سے
وحشت کے مہیب جنگلوں میں
آئے گی — تو اُس کا پھول لہجہ
کیا جب بھی صبا نفس رہے گا!؟
وہ خود کو ڈِس اونؔ کر سکے گی!؟

لے DISOWN
لے ALICE IN WONDER LAND

تنقید اور تخلیق

"آپ کی شاعری صرف خوشبو ہے
دل میں اُترتی ہُوئی
رُوح پر شبنمی ہاتھ رکھتی ہوئی
یہ مگر — ذہن کو صرف ہلکے سے چھُو کر گزر جائے گی
آپ اسے رنگ کا پیرہن دیجیے
کوئی آدرش اُونچا، انوکھا عقیدہ، کوئی گنجلک فلسفہ
سخت ناقابلِ فہم الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کریں
آپ کی سوچ میں کچھ تو گہرائی ہو — !"

آپ سچ کہہ رہے ہیں
مگر — دیکھیے نا — ابھی میرا فن کچّی عمروں میں ہے
(آپ اسے خواب ہی دیکھنے دیجیے)
اتنی گمبھیر دانشوری میں نہ اُلجھائیے)
میں نہیں چاہتی — کہ میرا فن
جواں ہونے سے قبل ہی بوڑھا ہو جائے
اور فلسفے کا عصا لے کے چلنے لگے !

اوتھیلو

اپنے فون پہ اپنا نمبر
بار بار ڈائل کرتی ہوں

سوچ رہی ہوں
کب تک اُس کا ٹیلی فون انگیج رہے گا
دل کڑھتا ہے
اتنی اتنی دیر تلک
وہ کس سے باتیں کرتا ہے !

متاعِ قلب و جگر ہیں، ہمیں کہیں سے ملیں
مگر وہ زخم جو اُس دستِ شبنمیں سے ملیں

نہ شام ہے، نہ گھنی رات ہے، نہ پچھلا پہر
عجیب رنگ تری چشمِ سُرمگیں سے ملیں

میں اِس وصال کے لمحے کا نام کیا رکھوں
ترے لباس کی شکنیں تری جبیں سے ملیں

ستائشیں مرے احباب کی نوازش ہیں
مگر صلے تو مجھے اپنے نکتہ چیں سے ملیں

تمام عمر کی نامعتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں، یقیں سے ملیں

یہی رہا ہے مقدر، مرے کسانوں کا
کہ چاند بوئیں اور ان کو گہن زمیں سے ملیں

سُکھ کے موسم کا دُکھ

آنے والی رُتوں کے آنچل میں
کوئی ساعت سعید کیا ہوگی
رات کے وقت رنگ کیا پہنوں
روشنی کی کلید کیا ہوگی
جب کہ بادل کی اوٹ لازم ہو
جانتی ہوں کہ دید کیا ہوگی
زرد موسم کی خشک ٹہنی سے
کونپلوں کی اُمید کیا ہوگی
چاند کے پاس بھی سنانے کو
اب کے کوئی نوید کیا ہوگی
گُل نہ ہوگا تو جشنِ خوشبو کیا
تم نہ ہوگے تو عید کیا ہوگی

عکسِ شکستِ خواب بہر سُو بکھیریے
چہرے پہ خاک، زخم پہ خوشبو بکھیریے

کوئی گزرتی رات کے پچھلے پہر کبھی
لمحوں کو قید کیجیے، گیسو بکھیریے

دھیمے سُروں میں کوئی مدھر گیت چھیڑیے
ٹھہری ہوئی ہواؤں میں جادو بکھیریے

گہری حقیقتیں بھی اُترتی رہیں گی پھر
خوابوں کی چاندنی تو لبِ جُو بکھیریے

دامانِ شب کے نام کوئی روشنی تو ہو
تارے نہیں نصیب تو آنسو بکھیریے

دشتِ غزال سے کوئی خوبی تو مانگیے
شہرِ جمال میں رمِ آہو بکھیریے

لیلۃ الشک

عجب پُراسرار سی فضا تھی
ہوا میں لوبان و عُود و عنبر کی آسمانی مہک رچی تھی
سپید، مخروطی، مومی شمعیں
عجیب ناقابلِ بیاں مذہبی تیقّن سے جل رہی تھیں
کہ جیسے آبی قباؤں میں کچھ اُداس، معصوم لڑکیاں
دونوں ہاتھ اُٹھائے
دعا میں مصروف ہوں
اور اُن کی چنبیلی سی اُنگلیوں کی لَو تھرتھرا رہی ہو!
دریچوں میں، طاقچوں میں
ننھّے چراغ یوں جھلملا رہے تھے
کہ جیسے نوزائیدہ فرشتے
زمیں کو دیکھ کر
تعجب سے اپنی پلکیں جھپک رہے ہوں!

کتاب الہام کی تلاوت

روشِ جبریل کے تصوّر کی جیسے تجسیم کر رہی تھی !
میں ہلکے رنگوں کے اک دوپٹے میں اپنی زیبائشیں چھپائے
ترے بہت ہی قریب
سر کو جھکائے بیٹھی تھی
اور تُو اپنے سادہ ملبوس میں مرے پاس تھا
مگر ہم ایک اور دنیا میں کھو چکے تھے
زمین کی خواہشیں دھنک پر ہی رہ گئی تھیں
وجود، تتلی کے پَر کی صورت، لطیف ہو کر
ہوا میں پرواز کر رہا تھا !
ہمیں بزرگوں نے یہ بتایا، کہ آج کی رات
آسمانوں میں زندگی اور موت کے فیصلے بھی انجام پا رہے ہیں
دعاؤں کی باریابیوں کا یہی سمے ہے !
سو ہم نے اپنے دیے جلا کر
حیاتِ تازہ کی آرزو کی
محبتوں کی ہمیشگی کی دعائیں مانگیں !

میں آج اپنے اکیلے گھر میں

ہوا کے رُخ پر چراغ ہاتھوں میں لے کے بیٹھی
خدا کے اُس فیصلے کا مفہوم سوچتی ہوں
کہ جس کی تکمیل میں یہ دیکھا
بدن تو زندہ ہے میرا اب تک
مگر مری روح مر چکی ہے
میں آج جا کر سمجھ سکی ہوں
کہ آج سے ایک سال پہلے
ترا جلایا ہُوا دیا جلد کیوں بجھا تھا!

وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے، پھول کدھر جائے گا

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اتر جائے گا

وہ ہواؤں کی طرح خانہ بجاں پھرتا ہے
ایک جھونکا ہے جو آئے گا، گزر جائے گا

وہ جب آئے گا تو پھر اس کی رفاقت کے لئے
موسمِ گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

آخرش وہ بھی کہیں ریت پہ بیٹھی ہو گی
تیرا یہ پیار بھی دریا ہے، اتر جائے گا

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
جرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

سالگرہ

یہی وہ دن تھا
جب آج سے چار سال پہلے
اسی روش پر، بنفشی بیلوں کے نرم سائے میں ہم ملے تھے
وہ لمحہ جب کہ ہمارے جسموں کو اپنے ہونے کا
حیرت آمیز، راحت افزا، نشاطِ اثبات مل سکا تھا
ہماری روحوں نے اپنا اپنا، نیا سنہری جسم لیا تھا
وہ ایک لمحہ
ہماری روحوں کو اپنے دستِ جمال سے چھُو رہا ہے اب تک
نظر کو شاداب کر رہا ہے
بدن کو مہتاب کر رہا ہے
ہم اس کے مقروض ہو چکے ہیں !
سو آؤ اب اس عظیم لمحے کے نام کوئی دعا کریں ہم
اٹھائیں ہاتھ
اور محبتوں کی تمام تر شدتوں سے چاہیں
کہ جب بھی چھبیس جون کا آفتاب نکلے
تو ہم اُسے ایک ساتھ دیکھیں !

پانیوں پانیوں جب چاند کا ہالہ اُترا
نیند کی جھیل پہ اک خواب پرانا اُترا

آزمائش میں کہاں عشق بھی پورا اُترا
حسن کے آگے تو تقدیر کا لکھا اُترا

دُھوپ ڈھلنے لگی، دیوار سے سایہ اُترا
سطح ہموار ہوئی، پیار کا دریا اُترا

یاد سے نام مٹا، ذہن سے چہرہ اُترا
چند لمحوں میں نظر سے تری کیا کیا اُترا

آج کی شب میں پریشاں ہُوں تو یُوں لگتا ہے
آج مہتاب کا چہرہ بھی ہے اُترا اُترا

میری وحشت رمِ آہو سے کہیں بڑھ کر تھی
جب مری ذات میں تنہائی کا صحرا اُترا

اک شبِ غم کے اندھیرے پہ نہیں ہے موقوف
تُو نے جو زخم لگایا ہے وہ گہرا اُترا

رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہدے

رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہدے —
آج کی شب نہ مرے پاس آئے
آج تسکینِ مشامِ جاں کو
دل کے زخموں کی مہک کافی ہے
یہ مہک، آج سرِ شام ہی جاگ اٹھی ہے
اب یہ بھیگی ہوئی بوجھل پلکیں
اور نمناک، اداس آنکھیں لیے
رت جگا ایسے منائے گی کہ خود بھی جاگے
اور پل بھر کے لئے، میں بھی نہ سونے پاؤں
دیومالائی فسانوں کی کسی منتظرِ موسمِ گل راجکماری کی خزاں بخت، دُکھی روح کی مانند
بھٹکنے کے لئے
کُو بہ کُو ابرِ پریشاں کی طرح جائے گی
دُور افتادہ سمندر کے کنارے بیٹھی

پھروں اُس سمت تکے گی کہ جہاں سے اکثر
اُس کے گم گشتہ جزیروں کی ہوا آتی ہے !
گئے موسم کی شناسا خوشبو
یوں رگ و پے میں اُترتی ہے
کہ جیسے کوئی چمکیلا، روپہلا سیال
جسم میں ایسے سرایت کر جائے
جیسے صحراؤں کی شریانوں میں پہلی بارش !
غیر محسوس سروشِ نکہت
ذہن کے ہاتھ میں وہ اِسم ہے
جس کی دستک
یاد کے بند دریچوں کو بڑی نرمی سے
ایسے کھولے گی کہ آنگن میرا
ہر دریچے کی الگ خوشبو سے
رنگ در رنگ چھلک جائے گا !

یہ دلآویز خزانے میرے

میرے پیاروں کی عطا بھی ہیں
مرے دل کی کمائی بھی ہیں
ان کے ہوتے ہوئے اوروں کی ضرورت کیا ہے
رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے
آج کی شب نہ مرے پاس آئے!

خوشبو بھی اس کی طرزِ پذیرائی پر گئی
دھیرے سے میرے ہاتھ کو چھُو کر گزر گئی

آندھی کی زد میں آئے ہوئے پھول کی طرح
میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے فضا میں بکھر گئی

شاخوں نے پھول پہنے تھے کچھ دیر قبل ہی
کیا ہو گیا، قبائے شجر کیوں اُتر گئی

اُن انگلیوں کا لمس تھا اور میری زُلف تھی
گیسو بکھر رہے تھے تو قسمت سنور گئی

اُترے نہ میرے گھر میں وہ مہتاب رنگ لوگ
میری دعائے نیم شبی بے اثر گئی

دُھوپ کا موسم

میں رنگ میں دیکھتی تھی، خوشبو میں سوچتی تھی!
مجھے گماں تھا
کہ زندگی اُجلی خواہشوں کے چراغ لے کر
مرے دریچوں میں روشنی کی نوید بن کر اُتر رہی ہے
میں کہر میں چاندنی پہن کر
بنفشی بادل کا ہاتھ تھامے
فضا میں پرواز کر رہی تھی
سماعتوں میں سحاب لہجوں کی بارشیں تھیں
بصارتوں میں گلاب چہروں کی روشنی تھی
ہوا کی ریشم رفاقتیں تھیں
صبا کی شبنم عنایتیں تھیں
حیات خوابوں کا سلسلہ تھی!
کُھلیں جو آنکھیں تو سارے منظر دھنک کے اُس پار رہ گئے تھے
نہ رنگ میرے، نہ خواب میرے

ہُوئے تو بس کچھ عذاب میرے
نہ چاند راتیں، نہ پھول باتیں
نہ نیل صبحیں، نہ جھیل شامیں
نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی دستک
حروف مفہوم کھو چکے تھے
علامتیں بانجھ ہوگئی تھیں
گلابی خوابوں کے پیرہن راکھ ہو چکے تھے
حقیقتوں کی برہنگی
اپنی ساری سفاکیوں کے ہمراہ
جسم و جاں پر اُتر رہی تھی
وہ مہرباں، سایہ دار بادل
عذاب کی رُت میں چھوڑ کر مجھ کو جا چکا تھا
زمین کی تیز دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی تھی!

پورا دُکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند

دن میں وحشت بہل گئی تھی
رات ہُوئی اور نکلا چاند

کس مقتل سے گزرا ہوگا
اتنا سہما سہما چاند

یادوں کی آباد گلی میں
گھوم رہا ہے تنہا چاند

میری کروٹ پر جاگ اُٹھے
نیند کا کتنا کچا چاند

میرے منہ کو کس حیرت سے
دیکھ رہا ہے بھولا چاند

اتنے گھنے بادل کے پیچھے
کتنا تنہا ہوگا چاند

آنسو روکے نور نہائے
دل دریا، تن صحرا چاند

اتنے روشن چہرے پر بھی
سُورج کا ہے سایا چاند

جب پانی میں چہرہ دیکھا
تُو نے کس کو سوچا چاند

برگد کی ایک شاخ ہٹا کر جانے کس کو جھانکا چاند
بادل کے ریشم جھولے میں بھور سمے تک سویا چاند

رات کے شانے پر سر رکھے دیکھ رہا ہے سپنا چاند
سوکھے پتوں کے جھرمٹ پر شبنم تھی یا ننھا چاند

ہاتھ ہلا کر رخصت ہو گا اس کی صورت ہجر کا چاند
صحرا صحرا بھٹک رہا ہے اپنے عشق میں سچا چاند

رات کے شاید ایک بجے ہیں
سوتا ہو گا میرا چاند!

اپنی زمین کے لیے ایک نظم

خواب، آنکھوں کی عبادت ہیں
گئی رات کے سناٹے ہیں
اپنے ہونے کا یقیں بھی ہیں
گل و نغمہ کا اثبات بھی ہیں
خواب کے رنگ دھنک سے بڑھ کر
کبھی پلکوں پہ ستارہ، کبھی آنکھوں میں سحاب
کبھی رخسار پہ لالہ، کبھی ہونٹوں پہ گلاب
کبھی زخموں کا، کبھی خندۂ گُل کا موسم
کبھی تنہائی کا چاند اور کبھی پچھلے پہر کی شبنم
خواب، جو تجزیۂ ذات ہوئے
ان کو جب فرد کی نیندوں کی نفی کر کے لکھا جائے
تو اک قوم کا ناقابلِ تردید تشخّص بن جائیں!

وہ خزاں زاد تھا
اور بنتِ بہار
اُس کی آنکھوں کے لیے خوابِ حیات
اپنے اس خواب کی تقدیس بچانے کے لیے
وہ اماوس کی گھنی راتوں میں
رت جگا کرتا رہا
اور ایسے، کہ نیا موسمِ گُل آیا تو سب نے دیکھا
جھلملاتے ہُوئے اک تارے کی اُنگلی تھامے
چاند پرچم پہ اُتر آیا ہے!
سنگریزوں میں گلاب اُگتے ہیں
شہرِ آذر میں اذاں گونجتی ہے
خوشبو آزاد ہے
جنگل کی ہوا بن کے سفر کرتی ہے
نئی مٹّی کا، نئی خواب زمینوں کا سفر
یہ سفر — رقصِ زمیں، رقصِ ہوا، رقصِ محبّت ہے
جو اَب لمحۂ موجود تک آ پہنچا ہے!

دل و نگاہ پہ کس طور کے عذاب اُترے
وہ ماہتاب ہی اُترا، نہ اُس کے خواب اُترے

کہاں وہ رُت کہ جبینوں پہ آفتاب اُترے
زمانہ بیت گیا ان کی آب و تاب اُترے

میں اُس سے کھُل کے ملوں سوچ کا حجاب اُترے
وہ چاہتا ہے مری رُوح کا نقاب اُترے

اُداس شب میں، کڑی دوپہر کے لمحوں میں
کوئی چراغ، کوئی صورتِ گلاب اُترے

کبھی کبھی ترے لہجے کی شبنمی ٹھنڈک
سماعتوں کے دریچوں پہ خواب خواب اُترے

فصیلِ شہرِ تمنا کی زرد بیلوں پر
ترا جمال کبھی صورتِ سحاب اُترے

تری ہنسی میں نئے موسموں کی خوشبو تھی
نوید ہو کہ بدن سے پُرانے خواب اُترے

سپردگی کا مجسّم سوال بن کے کِھلوں
مثالِ قطرۂ شبنم ترا جواب اُترے

تری طرح ، مری آنکھیں بھی معتبر نہ رہیں
سفر سے قبل ہی رستوں میں وہ سراب اُترے

وحی

عجیب موسم تھا وہ بھی، جبکہ
عبادتیں کورچشم تھیں
اور عقیدتیں اپنی ساری بینائی کھوچکی تھیں
خود اپنے ہاتھوں سے ترشے پتھر کو دیوتا کہہ کے
خیر و برکت کی نعمتیں لوگ مانگتے تھے!
مگر وہ اک شخص
جو ابھی اپنے آپ پر بھی نہ منکشف تھا
عجیب اُلجھن میں مبتلا تھا
یہ وہ نہیں ہیں، وہ کون ہوگا کا کربِ بے نام چکھ رہا تھا!
سو اپنے ان نارسا دُکھوں کی صلیب اُٹھائے
غموں کی نایافت شہریت کو تلاش کرتے
وہ شہرِ آذر سے دُور
اپنے تمام لمحے
حرا کے غاروں کے خواب آسا سکوت کو سونپنے لگا تھا
یہ سوچ کا اعتکاف بھی تھا

اور ایک اَن دیکھی رُوحِ کُل کے وجود کا اعتراف بھی تھا !
وہ رات بھی ارتکاز کی ایک رات تھی
جبکہ لمحہ بھر کو
فضا پہ سنّاٹا چھا گیا
اور ہواؤں کی سانس رُک گئی تھی
ستارۂ شب کے دل کی دھڑکن ٹھہر گئی تھی
گریز پا ساعتیں تحیّر زدہ تھیں
جیسے وجود کی نبض تھم گئی ہو !
یکایک اک روشنی جمال و جلال کے سارے رنگ لے کر
فضا میں گونجی
"پڑھو !"
"میں پڑھ نہیں سکوں گا !"
"پڑھو !"
"میں پڑھ نہیں سکوں گا !"
"پڑھو !"
"(مگر) میں کیا پڑھوں ؟"
پڑھو ! تم اپنے (عظیم) پروردگار کا نام لے کے

جو سب کو خلق کرتا ہے
جس نے انسان کو بنایا ہے منجمد خون سے
پڑھو (کہ) تمہارا پروردگار بے حد کریم ہے
(اور) جس نے تم کو قلم سے تعلیم دی
اسی نے بتائیں انسان کو وہ باتیں
کہ جن کو وہ جانتا نہیں تھا .....“

فضائے بے نطق جیسے اِقراء کا وِرد کرنے لگی تھی
وہ سارے لفظ، جو
تیرگی کے سیلاب میں کہیں بہہ چکے تھے
پھر روشنی کی لہروں میں
واپسی کے سفر کا آغاز کر رہے تھے

دریچۂ بے خیال میں
آگہی کے سُورج اُتر رہے تھے!

اس ایک پل میں
وہ میرا اُمّی
مدینۃُ العِلم بن چکا تھا!

یارب! مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخمِ ہُنر کو حوصلۂ لب کشائی دے

لہجے کو جُوئے آب کی وہ سنے نوائی دے
دُنیا کو حرف حرف کا بہنا سنائی دے

رگ رگ میں اُس کا لمس اُترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے، انتہائی دے

شہرِ سخن سے رُوح کو وہ آشنائی دے
آنکھیں بھی بند رکھوں تو رستہ سجھائی دے

تخیئل ماہتاب ہو، اظہار آئینہ
آنکھوں کو لفظ لفظ کا چہرہ دکھائی دے

دل کو لہو کروں تو کوئی نقش بن سکے
تو مجھ کو کربِ ذات کی سچی کمائی دے

دُکھ کے سفر میں منزلِ نایافت کچھ نہ ہو
زخمِ جگر سے زخمِ ہنر تک رسائی دے

میں عشقِ کائنات میں زنجیر ہو سکوں
مجھ کو حصارِ ذات کے شر سے رہائی دے

پہروں کی تشنگی پہ بھی ثابت قدم رہوں
دشتِ بلا میں، رُوحِ مجھے کربلائی دے

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا

قبائے جسم کے ہر تار سے گزرتا ہُوا
کرن کا پیار مجھے آفتاب کر دے گا

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں
بدن کو ناؤ، لہُو کو چناب کر دے گا

میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا، اور لاجواب کر دے گا

انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اُٹھ کے بند مری ہر کتاب کر دے گا

سکوتِ شہرِ سخن میں وہ پھول سا لہجہ
سماعتوں کی فضا خواب خواب کر دے گا

اسی طرح سے اگر چاہتا رہا پیہم
سخن وری میں مجھے انتخاب کر دے گا

مری طرح سے کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمہاری یاد کے نام انتساب کر دے گا!

گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اُتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح

راکھ کے ڈھیر پہ اب رات بسر کرنی ہے
جل چکے ہیں مرے خیمے، مرے خوابوں کی طرح

ساعتِ دید کے عارض ہیں گلابی اب تک
اوّلیں لمحوں کے گلنار حجابوں کی طرح

وہ سمندر ہے تو پھر رُوح کو شاداب کرے
تشنگی کیوں مجھے دیتا ہے سرابوں کی طرح

غیر ممکن ہے ترے گھر کے گلابوں کا شمار
میرے رِستے ہوئے زخموں کے حسابوں کی طرح

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی لیکن
شیلف میں رکھی ہُوئی بند کتابوں کی طرح

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

شوخ ہو جاتی ہے اب بھی تری آنکھوں کی چمک
گاہے گاہے، ترے دلچسپ جوابوں کی طرح

ہجر کی شب، مری تنہائی پہ دستک دے گی
تیری خوشبو، مرے کھوئے ہوئے خوابوں کی طرح

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دُلہن سجاؤں گی

سپرد کر کے اُسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی آنکھوں میں مسکراؤں گی

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے رُوٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی

اب اُس کا فن تو کسی اور سے ہُوا منسوب
میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی

وہ ایک رشتۂ بے نام بھی نہیں لیکن
میں اب بھی اُس کے اشاروں پہ سر جھکاؤں گی

بچھا دیا تھا گلابوں کے ساتھ اپنا وجود
وہ سو کے اُٹھے تو خوابوں کی راکھ اٹھاؤں گی

سماعتوں میں گھنے جنگلوں کی سانسیں ہیں
میں اب کبھی تری آواز سُن نہ پاؤں گی

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبّت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اُس کو بھول جاؤں گی

عیادت

پت جھڑ کے موسم میں تجھ کو
کون سے پھول کا تحفہ بھیجوں
میرا آنگن خالی ہے
لیکن میری آنکھوں میں
نیک دعاؤں کی شبنم ہے
شبنم کا ہر تارہ
تیرا آنچل تھام کے کہتا ہے
خوشبو، گیت، ہوا، پانی اور رنگ کو چاہنے والی لڑکی!
جلدی سے اچھی ہو جا
صبحِ بہار کی آنکھیں کب سے
تیری نرم ہنسی کا رستہ دیکھ رہی ہیں!

ایک دوست کے نام

لڑکی !
یہ لمحے بادل ہیں
گزر گئے تو ہاتھ کبھی نہیں آئیں گے
ان کے لمس کو پیتی جا
قطرہ قطرہ بھیگتی جا
بھیگتی جا تُو جب تک ان میں نم ہے
اور تیرے اندر کی مٹی پیاسی ہے
مجھ سے پُوچھ
کہ بارش کو واپس آنے کا رستہ کبھی نہ یاد ہوا
بال سُکھانے کے موسم ان پڑھ ہوتے ہیں !

آئینہ

لڑکی سر کو جھکائے بیٹھی
کافی کے پیالے میں چمچہ ہلا رہی ہے
لڑکا، حیرت اور محبّت کی شدّت سے پاگل
لانبی پلکوں کے لرزیدہ سایوں کو
اپنی آنکھ سے چُوم رہا ہے
دونوں میری نظر بچا کر
اک دُوجے کو دیکھتے ہیں ہنس دیتے ہیں!

میں دونوں سے دُور
دریچے کے نزدیک
اپنی ہتھیلی پر اپنا چہرہ رکھّے
کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں
گئے دنوں میں ہم بھی یونہی ہنستے تھے!

پکّے زخموں سے بدن سجنے لگے راتوں کے
سبز تحفے مجھے آنے لگے برساتوں کے

[illegible] رنگ دھنک کے مجھے چھونے آئے
عکس لہراتے ہیں آنکھوں میں مری ساتوں کے

بارشیں آئیں اور آنے لگے خوش رنگ عذاب
جیسے صندوقچے کھلنے لگے سوغاتوں کے

چھو کے گزری تھی ذرا جسم کو بارش کی ہوا
آنچ دینے لگے ملبوس جواں راتوں کے

پہروں باتیں وہ ہری بیلوں کے سائے سائے
واقعے خواب ہوئے ایسی ملاقاتوں کے

قریۂ جاں میں کہاں اب وہ سخن کے موسم
سوچ چمکاتی رہے رنگ گئی باتوں کے

کن لکیروں کی نظر سے ترا رستہ دیکھوں
نقش معدوم ہوئے جاتے ہیں ان ہاتھوں کے

تو مسیحا ہے، بدن تک ہے تری چارہ گری
تیرے امکاں میں کہاں زخم کڑی باتوں کے

قافلے نکہت و انوار کے بے سمت ہُوئے
جب سے دولہا نہیں ہونے لگے باراتوں کے

پھر رہے ہیں مرے اطراف میں بے چہرہ وجُود
ان کا کیا نام ہے، یہ لوگ ہیں کن ذاتوں کے

آسمانوں میں وہ مصروف بہت ہے۔ یا پھر
بانجھ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے

نم ہیں پلکیں تری اے موجِ ہوا ، رات کے ساتھ
کیا تجھے بھی کوئی یاد آتا ہے برسات کے ساتھ

رُوٹھنے اور منانے کی حدیں ملنے لگیں
چشم پوشی کے سلیقے تھے شکایات کے ساتھ

تجھ کو کھوکر بھی رہوں خلوتِ جاں میں تیری
جیت پائی ہے محبت نے عجب مات کے ساتھ

نیند لاتا ہُوا ، پھر آنکھ کو دُکھ دیتا ہوا
تجربے دونوں ہیں وابستہ ترے ہات کے ساتھ

کبھی تنہائی سے محروم نہ رکھا مجھ کو
دوست ہمدرد رہے کتنے مری ذات کے ساتھ

موسم کا عذاب چل رہا ہے
بارش میں گلاب جل رہا ہے

پھر دیدہ و دل کی خیر یا رب!
پھر ذہن میں خواب پل رہا ہے

صحرا کے سفر میں کب ہوں تنہا
ہمراہ سراب چل رہا ہے

آندھی میں دعا کو بھی نہ اُٹھا
یوں دستِ گلاب شل رہا ہے

کب شہرِ جمال میں ہمیشہ
وحشت کا عتاب حل رہا ہے

زخموں پہ چھڑک رہا ہے خوشبو
آنکھوں پہ گلاب مل رہا ہے

ماتھے پہ ہوا نے ہاتھ رکھّے
جسموں کو سحاب جھل رہا ہے

موجوں نے وہ دُکھ دیے بدن کو
اب لمسِ حباب کھل رہا ہے

قرطاسِ بدن پہ سلوٹیں ہیں
ملبوسِ کتاب گل رہا ہے!

تمہارا رویّہ

تمہارا رویّہ
مرے ساتھ ایسا رہا ہے
کہ جو
ایک کہنہ سیاسی مُدبّر کا
کمسن صحافی کے ہمراہ ہوتا ہے —
ہر حرف اپنے عواقب سے ہشیار
ہر لفظ تولا ہُوا
(مسئلہ فقرے بازی میں اُلجھا ہُوا)
کوئی بات ایسی نہ ہو پائے، جو بعد میں
اس کے حق میں
خود اس کی زباں سے چلایا ہُوا تیر بن جائے
(اور وہ پشیمان ہو)

خود سے ملنے کی فرصت کسے تھی

اپنی پندار کی کرچیاں
چُن سکوں گی
شکستہ اُڑانوں کے ٹوٹے ہُوئے پَر سمیٹوں گی
تجھ کو بدن کی اجازت سے رخصت کروں گی
کبھی اپنے بارے میں اتنی خبر ہی نہ رکھی تھی
ورنہ بچھڑنے کی یہ رسم کب کی ادا ہو چکی ہوتی
مرا حوصلہ
اپنے دل پر بہت قبل ہی منکشف ہو گیا ہوتا
لیکن — یہاں
خود سے ملنے کی فرصت کسے تھی!

جب ہوا تک یہ کہے' نیند کو رخصت جانو
ایسے موسم میں جو خواب آئیں غنیمت جانو

جب تک اُس سادہ قبا کو نہیں چھونے پاتی
موجۂ رنگ کا پندار سلامت جانو

جس گھروندے میں ہوا آتے ہوئے کترائے
دھوپ آجائے تو یہ اُس کی مروّت جانو

دشتِ غربت میں جہاں کوئی شناسا بھی نہیں
ابر رُک جائے ذرا دیر تو رحمت جانو

منہ پہ چھپڑ کاؤ ہو' اندر سے جڑیں کاٹی جائیں
اُس پہ اصرار' اسے عین محبت جانو

ورنہ یوں طنز کا لہجہ بھی کسے ملتا ہے
اُن کا یہ طرزِ سخن خاص عنایت جانو!

کن رس

یہ کُھلی کُھلی آنکھیں
یہ رُکا رُکا لہجہ
لب پہ بار بار آکے
ٹوٹتا ہُوا فقرہ
گرد میں اَٹی پلکیں
دُھوپ سے تپا چہرہ
سر جُھکائے آیا ہے
ایک عمر کا بھُولا
دل ہزار کہتا ہے
ہاتھ تھام لُوں اس کا

چُوم لوں یہ پیشانی
لَوٹنے نہ دوں تنہا
کوئی دل سے کہتا ہے
سارے حرف جھوٹے ہیں
اعتبار مت کرنا!
اعتبار مت کرنا!

کیسی بے چہرہ رُتیں آئیں وطن میں اب کے
پھول آنگن میں کھِلے ہیں نہ چمن میں اب کے

برف کے ہاتھ ہی، ہاتھ آئیں گے، اے موجِ ہَوا
حِدّتیں مجھ میں، نہ خوشبو کے بدن میں اب کے

دُھوپ کے ہاتھ میں جس طرح کھُلے خنجر ہوں
کھُردرے لہجوں کی نوکیں ہیں کرن میں اب کے

دل اُسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

جی یہ چاہے، کوئی پھر توڑ کے رکھ دے مجھ کو
لذّتیں ایسی کہاں ہوں گی تھکن میں اب کے

بے نسب ورثے کا بوجھ[1]

گہرے پانی کی چادر پہ لیٹی ہُوئی جل پری
اپنے آئینۂ تن کی عریانیوں کے تکلّم سے ناآشنا
موجۂ زلفِ آبِ رواں سے لپٹ کر
ہواؤں کی سرگوشیاں سنتے رہنے میں مشغول تھی :
ناگہاں
نیلگوں آسمانوں میں اُڑتے ہُوئے دیوتا نے
زمیں پر جو دیکھا
تو پرواز ہی بھول بیٹھا
نظر جیسے شل ہو گئی
اُڑنا چاہا — مگر
خواہشِ بے اماں نے بدن میں قیامت مچا دی
مگر وصل کیسے ہو ممکن

---

[1] ماخوذ از : W. B. YEATS — LYDA & THE SWAN

کہ دہ دیوتا — آسمانوں کا بیٹا ہُوا !
جل پری کا تعلق زمیں سے
سو خواہش کے عفریت نے
آسماں اور زمیں کے کہیں درمیاں سرزمینوں کی
مخلوق کا رُوپ دھارا
بہت کھَولتی خواہشوں کے تلاطم سے سرشار نیچے اُترنے لگا !

جل پَری —
اس قدر دودھیا خوشنما ہنس کو
اپنی جانب لپکتے ہُوئے دیکھ کر مسکرائی
مگر اس کی یہ مسکراہٹ ہنسی بننے سے قبل ہی چیخ میں ڈھل گئی
اُس کا انکار بے سُود
وحشت، سراسیمگی، اجنبی پھڑپھڑاہٹ میں گُم ہو گئی
آہ وزاری کے باوصف
مضبوط پَر اُس کا سارا بدن ڈھک چکے تھے !
اُجلی گردن میں وحشت زدہ چونچ اُتری چلی جا رہی تھی !
اُس کے آنسو

سمندر میں شبنم کی مانند حل ہو گئے !

سسکیاں

تند موجوں کی آواز میں بے صدا ہو گئیں !

ہنس اپنے لہو کی دہکتی ہُوئی وحشتیں

نیم بے ہوشں خوشبو کے رس سے بجھاتا رہا

اور پھر اپنے پیاسے بدن کے مساموں پہ

بھیگی ہُوئی لذّتوں کی تھکن اوڑھ کر اُڑ گیا !

جل پری

گہرے نیلے سمندر کی بیٹی

اپنی مفتوح دنا منتظر کوکھ میں

آسماں اور زمیں کے کہیں درمیاں رہنے والوں کا

بے شجرہ و بے نسب ورثے کا بوجھ تھامے ہُوئے

آج تک رو رہی ہے !

کیا کیا نہ خواب ہجر کے موسم میں کھو گئے
ہم جاگتے رہے تھے مگر بخت سو گئے

اُس نے پیام بھیجے تو رستے میں رہ گئے
ہم نے جو خط لکھے وہ ہوا بُرد ہو گئے

مَیں شہرِ گُل میں زخم کا چہرہ کسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو کانٹے چبھو گئے

آنچل میں پھول لے کے کہاں جا رہی ہُوں مَیں
جو آنے والے لوگ تھے، وہ لوگ تو گئے

کیا جانیے، اُفق کے اُدھر کیا طلسم ہے
لَوٹے نہیں زمین پہ، اک بار جو گئے

جیسے بدن سے قوسِ قزح پھُوٹنے لگی
بارش کے ہاتھ پھول کے سب زخم دھو گئے

آنکھوں میں دھیرے دھیرے اُتر کے پُرانے غم
پلکوں میں ننھے ننھے ستارے پرو گئے

وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہو گئی
کیا عمر تھی کہ رات ہُوئی اور سو گئے!

کیا دُکھ تھے، کون جان سکے گا، نگارِ شب!
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے!

ویسے تو کج ادائی کا دُکھ کب نہیں سہا
آج اُس کی بے رُخی نے مگر دل دُکھا دیا

موسم مزاج تھا، نہ زمانہ سرشت تھا
میں اب بھی سوچتی ہوں وہ کیسے بدل گیا

دُکھ سب کے مشترک تھے مگر حوصلے جُدا
کوئی بکھر گیا تو کوئی مُسکرا دیا

جھوٹے تھے سارے پھول جو پیڑوں پہ آئے تھے
کوئی شگوفہ بھی تو ثمرور نہیں ہُوا

وہ چوٹ کیا ہوئی کہ جو آنسو نہ بن سکی
وہ درد کیا ہُوا کہ جو مصرعہ نہ بن سکا

ایسے بھی زخم تھے کہ چھپاتے پھرے ہیں ہم
درپیش تھا کسی کے کرم کا معاملہ

آلودۂ سخن بھی نہ ہونے دیا اُسے
ایسا بھی دُکھ ملا جو کسی سے نہیں کہا

تیرا خیال کر کے میں خاموش ہو گئی
ورنہ زبانِ خلق سے کیا کیا نہیں سُنا

میں جانتی ہوں میری بھلائی اِسی میں تھی
لیکن یہ فیصلہ بھی کچھ اچھا نہیں ہُوا

میں برگ برگ اُس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا!

ڈسنے لگے ہیں خواب مگر کس سے بولیے
میں جانتی تھی' پال رہی ہوں سنپولیے!

بس یہ ہُوا کہ اُس نے تکلّف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

پلکوں پہ کچّی نیندوں کا رس پھیلتا ہو جب
ایسے میں آنکھ دھوپ کے رُخ کیسے کھولیے

تیری برہنہ پائی کے دُکھ بانٹتے ہُوئے
ہم نے خود اپنے پاؤں میں کانٹے چبھو لیے

میں تیرا نام لے کے تذبذب میں پڑ گئی
سب لوگ اپنے اپنے عزیزوں کو رو لیے!

"خوشبو کہیں نہ جائے" پہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

تصویر جب نئی ہے' نیا کینوس بھی ہے
پھر طشتری میں رنگ پُرانے نہ گھولیے

بائیسویں صلیب

صبح کے وقت' اذاں سے پہلے
اب سے بائیس برس قبل اُدھر
عمر میں پہلی دفعہ روئی تھی میں
کرب میں ڈوبی ہُوئی چیخ کو سن کر مری ماں ہنس دی تھی
مری آواز نے اُس کو شاید
اُس کے ہونے کا یقیں بخشا تھا
دُکھ کے اک لمبے سفر اور اذیت کی کئی راتیں بسر کرنے پر
اُس نے تخلیق کیا تھا مجھ کو
میری تخلیق کے بعد اُس نے نئی زندگی پائی تھی جسے
آنسوؤں نے مرے بپتسمہ دیا!

ہر نئے سال کے چوبیس نومبر کی سحر
دُکھ کا اک رنگ نیلے کے مرے گھر اُتری
اور میں ہر رنگ کے شایان سواگت کے لیے

نذر کرتی رہی
کیا کیا تحفے!
کبھی آنگن کی ہری بیلوں کی ٹھنڈی چھایا
کبھی دیوار پہ اُگتے ہُوئے پھولوں کا بنفشی سایہ
کبھی آنکھوں کا کوئی طفلکِ معصوم
کبھی خوابوں کا، کوئی شہزادہ کہ تھا قاف کا رہنے والا
کبھی نیندوں کے مسلسل کئی موسم
تو کبھی
جاگتے رہنے کی بے انت رُتیں!
(رس میں بھیگی ہوئی برسات کی کاجل راتیں
چاندنی پی کے مچلتی ہُوئی پاگل راتیں!)

وقت نے مجھ سے کئی دان لیے
اس کی بانہیں، مری مضبوط پناہیں لے لیں
مجھ تک آتی ہُوئی اس سوچ کی راہیں لے لیں
حد تو یہ ہے کہ وہ بے فیض نگاہیں لے لیں
رنگ تو رنگ تھے، خوشبوئے حنا تک لے لی
سایۂ ابر کا کیا ذکر، ردا تک لے لی

کانپتے ہونٹوں سے موہوم دعا تک لے لی
ہر نئے سال کی اک تازہ صلیب
میرے بے رنگ دریچوں میں گڑی
قرضِ زیبائی طلب کرتی رہی
اور میں تقدیر کی مشاطۂ مجبور کی مانند اِدھر
اپنے خوابوں سے لہو لے لے کر
دستِ قاتل کی حنا بندی میں مصروف رہی —
اور یہاں تک — کہ صلیبیں مری قامت سے بڑی ہونے لگیں!

ہاں کبھی نرم ہوا نے بھی دریچوں پہ مرے، دستک دی
اور خوشبو نے مرے کان میں سرگوشی کی
رنگ نے کھیل رچانے کو کہا بھی، لیکن
میرے اندر کی یہ تنہا لڑکی
رنگ و خوشبو کی سکھی بن نہ سکی
ہر نئی سالگرہ کی شمعیں
میرے ہونٹوں کی بجائے
شام کی سرد ہوا نے گل کیں

اور میں جاتی ہوئی رُت کے شجر کی مانند
تن تنہا و تہی دست کھڑی
اپنے ویران کواڑوں سے ٹکائے سر کو
خود کو تقسیم کے نادیدہ عمل میں سے گزرتے ہوئے بس دیکھا کی!

آج اکیس صلیبوں کو لہو دے کے خیال آتا ہے
اپنے بائیسویں مہمان کی کس طرح پذیرائی کروں
آج تو آنکھ میں آنسو بھی نہیں!
ماں کی خاموش نگاہیں
مرے اندر کے شجر میں کسی کونپل کی مہک ڈھونڈتی ہیں
اپنے ہونے سے مرے ہونے کی مربوط حقیقت کا سفر چاہتی ہیں
خالی سیپی سے گہر مانگتی ہیں!
میں تو موتی کے لئے گہرے سمندر میں اُترنے کو بھی راضی ہوں۔ مگر
ایسی برسات کہاں سے لاؤں
جو مری روح کو بپتسمہ دے!

یاد کیا آئی کہ روشن ہو گئے آنسو کے گھر
جنگلوں میں شام اُتری جل اُٹھے جگنو کے گھر

رات کی رانی کا آنچل تھام کر چلتی ہُوں میں
آج کی شب زندگی مہماں ہوئی خوشبو کے گھر

رات میں بھیگے ہُوئے جنگل کا منظر دیکھنے
شب گزیدہ لوگ کیسے جائیں گے جگنو کے گھر

کیا عجب جو سر کٹے لوگوں کی پرچھائیں ملیں
شہر میں کھُلنے لگے ہیں جا بجا جادو کے گھر

تجھ میں خواہش تھی کہ گہری رات کا تارہ بنے
آ، کہ اب پہلے سی بھی تاریک ہیں گیسو کے گھر

پہلے یہ منظر پڑھا تھا صرف، اب دیکھا بھی ہے
بانسری بجتی رہی، جلتے رہے نیرو کے گھر!

درد پھر جاگا ، پرانا زخم پھر تازہ ہُوا
فصلِ گُل کتنے قریب آئی ہے اندازہ ہُوا

صبح یوں نکلی ، سنور کے جس طرح کوئی دُلہن
شبنم آویزہ ہُوئی ، رنگِ شفق غازہ ہُوا

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اُس کے گھر کا دروازہ ہوا

ریل کی سیٹی میں کیسے ہجر کی تمہید تھی
اُس کو رخصت کر کے گھر لَوٹے تو اندازہ ہُوا

امر

ہم میں بھی نہیں وہ روشنی اب
اور تم بھی تمام جل بجھے ہو
دونوں سے بچھڑ گئی ہیں کرنیں
ویران ہیں شہرِ دل کی راتیں
اب خواب ہیں چاندنی کی باتیں
جنگل میں ٹھہر گئی ہیں شامیں !

لیکن
یہ جو دفعتاً اُدھر سے
گُل مہر کی شاخ کو ہٹا کر
اُبھرا ہے اُفق پہ چاند میرا
اُس چاند کا حُسن تو وہی ہے !

یاد کیا آئیں گے وہ لوگ جو آئے ، نہ گئے
کیا پذیرائی ہو اُن کی جو بُلائے نہ گئے

اب وہ نیندوں کا اُجڑنا تو نہیں دیکھیں گے
وہی اچھے تھے جنہیں خواب دکھائے نہ گئے

رات بھر میں نے کھُلی آنکھوں سے سپنا دیکھا
رنگ وہ پھیلے کہ نیندوں سے چُرائے نہ گئے

بارشیں رقص میں تھیں اور زمیں ساکت تھی
عام تھا فیض مگر رنگ کمائے نہ گئے

پَر سمیٹے ہُوئے شاخوں میں پرندے آ کر
ایسے سوئے کہ ہوا سے بھی جگائے نہ گئے

تیز بارش ہو ، گھنا پیڑ ہو ، اک لڑکی ہو
ایسے منظر کبھی شہروں میں تو پائے نہ گئے

روشنی آنکھ نے پی اور سرِ مژگانِ خیال
چاند وہ چمکے کہ سورج سے بُجھائے نہ گئے !

گلاب ہاتھ میں ہو، آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبّت کا استعارہ ہو
میں گہرے پانی کی اس رَو کے ساتھ بہتی رہوں
جزیرہ ہو کہ مقابل کوئی کنارہ ہو
کبھی کبھار اُسے دیکھ لیں، کہیں مل لیں
یہ کب کہا تھا کہ وہ خوش بدن ہمارا ہو
قصور ہو تو ہمارے حساب میں لکھ جائے
محبّتوں میں جو احسان ہو، تمہارا ہو
یہ اتنی رات گئے کون دستکیں دے گا
کہیں ہَوا کا ہی اُس نے نہ رُوپ دھارا ہو
اُفق تو کیا ہے، درِ کہکشاں بھی چھو آئیں
مسافروں کو اگر چاند کا اشارا ہو
میں اپنے حصّے کے سُکھ جس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح کا پیارا ہو
اگر وجُود میں آہنگ ہے تو وصل بھی ہے
میں چاہے نظم کا ٹکڑا، وہ نثر پارہ ہو!

نیم خوابی کا فسوں ٹوٹ رہا ہو جیسے
آنکھ کا نیند سے دل چھوٹ رہا ہو جیسے

رنگ پھیلا تھا لہو میں نہ ستارہ چمکا
اب کے ہر لمس ترا جھوٹ رہا ہو جیسے

پھر شفق رنگ ہوئی کوچۂ جاناں کی زمیں
آبلہ پاؤں کا پھر پھوٹ رہا ہو جیسے

روشنی پائی نہیں، رات بھی باقی ہے ابھی
چاند سے ربط مگر ٹوٹ رہا ہو جیسے!

سرخ بیلیں تو ستونوں پہ چڑھی ہیں لیکن
کوئی آنگن کا سکوں لوٹ رہا ہو جیسے!

کرنوں کے قدم

خوش پوش مسافروں کے آگے
ننھا سا دہ کم لباس بچہ
کس شانِ انا سے چل رہا تھا
سورج کی تمازتوں کے باوصف
سائے کی تلاش تھی۔ نہ اُس کو
درکار تھیں نقرئی پناہیں
جیبوں پہ نگاہ تھی نہ رُخ پر
سِکّوں سے وہ بے نیاز آنکھیں
کچھ اور ہی ڈھونڈنے چلی تھیں
اُس کو تو مسافروں سے بڑھ کر
سایوں سے لگاؤ ہو گیا تھا
اپنے نئے کھیل میں مگن وہ
لوگوں کے بہت قریب جا کر
میلی بے رنگ اُنگلیوں سے
سایوں کو مزے سے گن رہا تھا

دلدل سے اُگا ہُوا وہ بچہ
خوشبو کا حساب کر رہا تھا
کیچڑ میں پلا ہُوا وہ کیڑا
کرنوں کا شمار کر رہا تھا
کس نے اُسے گنتیاں سکھائیں
جس نے کبھی زندگی میں اپنی
اسکول کی شکل تک نہ دیکھی
اُستاد کا نام تک نہ جانا

سچ یہ ہے کہ سورجوں کو چاہے
بادل کا کفن بھی دے کے رکھیں
کب روشنیاں ہوئی ہیں زنجیر!
تنویر کا ہاتھ کس نے تھاما!
کرنوں کے قدم کہاں رُکے ہیں!

ہوا کی دُھن پر بن کی ڈالی ڈالی گائے
کوئل کوکے، جنگل کی ہریالی گائے

رُت وہ ہے جب کونپل کی خوشبو سُر مانگے
پُروا کے ہمراہ عمر یا بالی گائے

مورنی بن کر پردا سنگ میں جب بھی ناچوں
پُروا بھی بن میں ہو کر متوالی گائے

رات گئے میں بِندیا کھوجنے جب بھی نکلوں
کنگن کھنکے اور کانوں کی بالی گائے

رنگ منایا جائے، خوشبو کھیلی جائے
پھول ہنسیں، پتّے ناچیں اور مالی گائے

میرے بدن کا رُواں رواں اس میں بھیگے
رات نشے میں اور ہَوا بھوپالی گائے

سجے ہُوئے ہیں پلکوں پر خوش رنگ دیے سے
آنکھ ستاروں کی چھاؤں دیوالی گائے

ہوا کے سنگ چلے رہ رہ کے لَے بنسی کی
جیسے دریا پار کوئی بھٹیالی گائے

ساجن کا اصرار کہ ہم تو گیت سُنیں گے
گوری چپ ہے لیکن مکھ کی لالی گائے

منہ سے نہ بولے، نین مگر مسکاتے جائیں
اُجلی دھوپ نہ بولے، رینا کالی گائے

دھانی بانکیں جب بھی سہاگن کو پہنائے
شوخ سُروں میں کیا کیا چوڑی والی گائے

محنت کی سندرتا کھیتوں میں پھیلی ہے
نرم ہوا کی دُھن پر دھان کی بالی گائے

مورنی

بارش نے
جب سے مجھ کو پازیب پہنائی ہے
میں رقص میں ہوں
اور اتنی خوش ہوں
اپنے پاؤں کی بدرنگی کو
دیکھ دیکھ کے بھول رہی ہوں
پر پھیلائے
بھیگے ہُوئے جنگل میں مسلسل ناچ رہی ہوں!

نظر کی تیزی میں ہلکی ہنسی کی آمیزش
ذرا سی دھوپ میں کچھ چاندنی کی آمیزش

یہی تو وجہِ شکستِ وفا ہوئی میری
خلوصِ عشق میں سادہ دلی کی آمیزش

مرے لیے ترے الطاف کی وہ اُجلی رُت
عذابِ مرگ میں تھی زندگی کی آمیزش

وہ چاند بن کے مرے جسم میں پگھلتا رہا
لہُو میں ہوتی گئی روشنی کی آمیزش

یہ کون بن میں بھٹکتا تھا جس کے نام پہ ہے
ہوائے دشت میں آشفتگی کی آمیزش

زمیں کے چہرے پہ بارش کے پہلے پیار کے بعد
خوشی کے ساتھ تھی حیرانگی کی آمیزش

سمندروں کی طرح مری آنکھ ساکت ہے
مگر سکوت میں کس بے کلی کی آمیزش

موسم

چڑیا پوری بھیگ چکی ہے
اور درخت بھی پتّہ پتّہ ٹپک رہا ہے
گھونسلا کب کا بکھر چکا ہے
چڑیا پھر بھی چہک رہی ہے
انگ انگ سے بول رہی ہے
اس موسم میں بھیگتے رہنا کتنا اچّھا لگتا ہے !

خوشبو ہے وہ تو چھُو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اُتر نہ جائے

خود پھول نے بھی ہونٹ کیے اپنے نیم وا
چوری تمام رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے

ایسا نہ ہو کہ لمس بدن کی سزا بنے
جی پھول کا ہوا کی محبت سے بھر نہ جائے

اس خوف سے وہ ساتھ نبھانے کے حق میں ہے
کھو کر مجھے یہ لڑکی کہیں دُکھ سے مر نہ جائے

شدت کی نفرتوں میں سدا جس نے سانس لی
شدت کا پیار پا کے خلا میں بکھر نہ جائے

اُس وقت تک کناروں سے ندی چڑھی رہے
جب تک سمندروں کے بدن میں اُتر نہ جائے

پلکوں کو اُس کی اپنے دوپٹے سے پونچھ دوں
کل کے سفر میں آج کی گردِ سفر نہ جائے

میں کس کے ہاتھ بھیجوں اُسے آج کی دُعا
قاصد ہوا، ستارہ کوئی اُس کے گھر نہ جائے

رنگ خوشبو میں اگر حل ہو جائے　　وصل کا خواب مکمل ہو جائے
چاند کا چوما ہُوا سُرخ گلاب　　تیتری دیکھے تو پاگل ہو جائے
میں اندھیروں کو اُجالوں ایسے　　تیرگی آنکھ کا کاجل ہو جائے
دوش پر بارشیں لے کے گھومیں　　میں ہوا اور وہ بادل ہو جائے
نرم سبزے پہ ذرا جُھک کے چلے　　شبنمی رات کا آنچل ہو جائے
عمر بھر تھامے رہے خوشبو کو　　پھول کا ہاتھ مگر شل ہو جائے
چڑیا پتوں میں سمٹ کر سوئے
پیڑ یوں پھیلے کہ جنگل ہو جائے

پہرے

پسِ شہرِ گل
سرخ پتھر کی دیوار پر
آ کے موجِ صبا
عمر بھر دستکیں دے تو کیا
صرف یہ ہے کہ ہاتھ اس کے تھک جائیں گے !

اِتنا دھیان میں رکھنا

اُجلے آج کی سچائی کو
مَیلی کل کی دھندلاہٹ میں
کیا اوروں کی صورت تم بھی پرکھوگے ؟
خیر — تمہاری مرضی
لیکن اِتنا دھیان میں رکھنا
سورج پر بھی رات کی ہم آغوشی کا الزام رہا ہے !

مجبوری

ہوائیں
دستکوں میں میرا نام لے رہی ہیں
میں، کواڑ کیسے کھولوں
میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے ہیں !

تعبیر

سیہ راتوں کے آگے سرخرو ہوں
چاند سے آنکھیں ملا کر بات کرتی ہوں
کہ میں نے عمر میں دیکھا ہے پہلی بار یہ منظر
مری نیندیں مرے خوابوں کے آگے سر اُٹھا کر چل رہی ہیں !

واٹرلُو

اُس کے کنوّل ہاتھوں کی خوشبو
کتنی سبز آنکھوں نے پینے کی خواہش کی تھی
کتنے چمکیلے بالوں نے
چُھوئے جانے کی آس میں خود کو کیسا کیسا بکھرایا تھا
کتنے پھول اُگانے والے پاؤں
اُس کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھائے پھرتے تھے
لیکن وہ ہر خواب کے ہاتھ جھٹکتی ہوئی
جنگل کی مغرور ہوا کی صورت
اپنی دُھن میں اُڑتی پھرتی

آج — مگر
سورج نے کھڑکی سے جھانکا
تو اُس کی آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں
وہ مغرور سی، تیکھی لڑکی
عام سی آنکھوں، عام سے بالوں والے
اک اکھڑ پردیسی کے آگے
دو زانو بیٹھی
اس کے بُوٹ کے تسمے باندھ رہی تھی!

نئی رات

گہن کو اپنے تن کا نوشتہ جان کے، میں نے
روشنیوں سے سارے ناتے توڑ لیے تھے
رات کو اپنی سکھی مان کے
اپنے سارے دُکھ بس اُس سے کہہ کے
جی ہلکا کر لیتی تھی
شام ڈھلے، تنہائی کے بازو پر سر رکھتے سو جاتی
اور نیند کے بے آباد جزیروں میں تنہا
اک تھکی ہُوئی خوشبو کی طرح بھٹکا کرتی !

آج بھی میں تنہا ہوں سفر میں
لیکن خود سے پُوچھ رہی ہوں
میرے وجود کے گرد یہ کیسا ہالہ ہے !
یوں لگتا ہے
چادرِ شب شانوں سے سرکی جاتی ہے
چاند مرے آنچل میں ستارے ٹانک رہا ہے !

اپنی ہی صدا سنوں کہاں تک — جنگل کی ہَوا رہوں کہاں تک
ہر بار ہَوا نہ ہوگی دَر پر — ہر بار مگر اُٹھوں کہاں تک
دم گھُٹتا ہے گھر میں حبس وہ ہے — خوشبو کے لئے رکوں کہاں تک
پھر آکے ہوائیں کھول دیں گی — زخم اپنے رفو کروں کہاں تک
ساحل پہ سمندروں سے بچ کر — میں نام ترا لکھوں کہاں تک
تنہائی کا ایک ایک لمحہ — ہنگاموں سے قرض لوں کہاں تک
گر لمس نہیں تو لفظ ہی بھیج — میں تجھ سے جُدا رہوں کہاں تک
سُکھ سے بھی تو دوستی کبھی ہو — دُکھ سے ہی گلے ملوں کہاں تک
منسوب ہو ہر کرن کسی سے — اپنے ہی لیے جلوں کہاں تک

آنچل مرے بھر کے پھٹ رہے ہیں
پھول اُس کے لیے چُنوں کہاں تک

دشمن ہے اور ساتھ رہے جان کی طرح
مجھ میں اُتر گیا ہے وہ سرطان کی طرح

جکڑے ہوئے ہے تن کو مرے اُس کی آرزو
پھیلا ہُوا ہے جال سا شریان کی طرح

دیوار و در نے جس کے لیے تجھ کاٹے تھے
آیا تھا چند روز کو مہمان کی طرح

دُکھ کی رُتوں میں پیڑ نے تنہا سفر کیا
پتّوں کو پہلے بھیج کے سامان کی طرح

گہرے خنک اندھیرے میں اُجلے تکلّفات
گھر کی فضا بھی ہو گئی شیراز کی طرح

ق

ڈوبا ہُوا ہے حسنِ سخن میں سکوتِ شب
تارِ ربابِ رُوح میں کلیان کی طرح
آہنگ کے جمال میں انجیل کی دعا
نرمی میں اپنی، سورۂ رحمان کی طرح

سنّاٹا فضا میں بہہ رہا ہے
دُکھ اپنے ہَوا سے کہہ رہا ہے

برفیلی ہوا میں تن شجر کا
ہونے کا عذاب سہہ رہا ہے

باہر سے نئی سفیدیاں ہیں
اندر سے مکان ڈھ رہا ہے

حل ہو گیا خون میں کچھ ایسے
رگ رگ میں وہ نام بہہ رہا ہے

جنگل سے ڈرا ہُوا پرندہ
شہروں کے قریب رہ رہا ہے

چھونے سے قبل رنگ کے پیکر پگھل گئے
مٹھی میں آ نہ پائے کہ جگنو نکل گئے

پھیلے ہوئے تھے جاگتی نیندوں کے سلسلے
آنکھیں کھلیں تو رات کے منظر بدل گئے

کب حدتِ گلاب پہ حرف آنے پائے گا
تتلی کے پر اُڑان کی گرمی سے جل گئے

آگے تو صرف ریت کے دریا دکھائی دیں
کن بستیوں کی سمت مسافر نکل گئے

پھر چاندنی کے دام میں آنے کو تھے گلاب
صد شکر نیند کھونے سے پہلے سنبھل گئے

کیسے چھوڑیں اُسے تنہائی پر — حرف آتا ہے مسیحائی پر

اُس کی شہرت بھی تو پھیلی ہر سُو — پیار آنے لگا رسوائی پر

ٹھہرتی ہی نہیں آنکھیں جاناں! — تیری تصویر کی زیبائی پر

رشک آیا ہے بہت حسن کو بھی — قامتِ عشق کی رعنائی پر

سطح سے دیکھ کے اندازے لگیں — آنکھ جاتی نہیں گہرائی پر

ذکر آئے گا جہاں بھونروں کا — بات ہوگی مرے ہرجائی پر

خود کو خوشبو کے حوالے کر دیں
پھول کی طرزِ پذیرائی پر

چہرہ نہ دکھا صدا سنا دے — جینے کا ذرا تو حوصلہ دے

دکھلا کسی طور اپنی صورت — آنکھوں کو مزید مت سزا دے

چھو کر مری سوچ ۔ میرے تن پہ — بیلیں ہرے رنگ کی اُگا دے

جاناں! نہ خیال دوستی کر — دے زہر جواب تو تیز سا دے

شدت ہے مزاج میرے خوں کا — نفرت کی بھی دے تو انتہا دے

ٹوٹی ہوئی شام منتظر ہے — جھک کر مجھے آئینہ دکھا دے

دل پھٹنے لگا ہے ضبطِ غم سے — مالک! کوئی درد آشنا دے

سوئی ہے ابھی تو جاگ شبنم — ایسا نہ ہو موجِ گُل اُٹھا دے

چکھوں ممنوعہ ذائقے بھی
دل! سانپ سے دوستی بڑھا دے

آج کی رات

نیند پلکوں کی جھالر کو چھوتی ہُوئی
اوس میں اپنا آنچل بھگو کے
مرے دُکھتے ماتھے پہ رکھنے چلی ہے
مگر ۔۔ آنکھ اور ذہن کے درمیاں
آج کی شب وہ کانٹے بچھے ہیں
کہ نیندوں کے آہستہ رَو پھول پاؤں بھی چلنے سے معذور ہیں
ہر بُنِ مو میں اک آنکھ اُگ آئی ہے
جس کی پلکیں نکلنے سے پہلے کہیں جھڑ چکی ہیں

اور اب رات بھر
روشنی اور کُھلی آنکھ کے درمیاں
نیند مصلوب ہوتی رہے گی!

دستِ شب پر دکھائی کیا دیں گی
سلوٹیں روشنی میں اُبھریں گی

گھر کی دیواریں میرے جانے پر
اپنی تنہائیوں کو سوچیں گی

اُنگلیوں کو تراش دوں، پھر بھی
عادتاً اُس کا نام لکھّیں گی

رنگ و بُو سے کہیں پناہ نہیں
خواہشیں بھی کہاں اماں دیں گی

ایک خوشبو سے بچ بھی جاؤں اگر
دوسری نکہتیں جکڑ لیں گی

خواب میں تتلیاں پکڑنے کو
نیندیں بچوں کی طرح دوڑیں گی

کھڑکیوں پر دبیز پردے ہوں
بارشیں پھر بھی دستکیں دیں گی!

ذرّے سرکش ہوئے، کہنے میں ہوائیں بھی نہیں
آسمانوں پہ کہیں تنگ نہ ہو جائے زمیں

آ کے دیوار پہ بیٹھی تھیں کہ پھر اُڑ نہ سکیں
تتلیاں بانجھ مناظر میں نظر بند ہوئیں

پیڑ کی سانسوں میں چڑیا کا بدن کھنچتا گیا
نبض رکتی گئی، شاخوں کی رگیں کھلتی گئیں

ٹوٹ کر اپنی اُڑانوں سے، پرندے آئے
سانپ کی آنکھیں، درختوں پہ بھی اب اُگنے لگیں

شاخ در شاخ الجھتی ہیں رگیں پیڑوں کی
سانپ سے دوستی، جنگل میں نہ بھٹکائے کہیں

گود لے لی ہے چٹانوں نے سمندر سے نمی
جھوٹے پھولوں کے درختوں پہ بھی خوشبوئیں ٹکیں!

نیا دُکھ

یہ دُکھ جو برف کا طوفان بن کے آیا ہے
پہاڑ والوں پہ کیسے عذاب لایا ہے

یہ زندہ رہنے کی خاطر، اجازتوں کا دُکھ
بطور قرض کے حاصل، محبتوں کا دُکھ

یہ غم کہ رات کی دہلیز اپنا گھر ہو گی
تمام عالمِ امکاں میں جب سحر ہو گی

یہ دُکھ کہ چھوڑ گئے انتہا پہ آکر ساتھ
سیاہ ماتھوں پہ تقدیر لکھنے والے ہاتھ

مسافرانِ شبِ غم، اسیرِ دار ہُوئے
جو رہنما تھے، بِکے، اور شہر یار ہُوئے

وہ جس سے رہا آج تک آواز کا رشتہ
بھیجے مری سوچوں کو اب الفاظ کا رشتہ

تتلی سے مرا پیار کچھ ایسے بھی بڑھا ہے
دونوں میں رہا لذتِ پرواز کا رشتہ

سب لڑکیاں اک دوسرے کو جان رہی ہیں
یوں عام ہُوا مسلکِ شہناز کا رشتہ

راتوں کی ہَوا اور مرے تن کی مہک میں
مشترکہ ہُوا اک درِ کم باز کا رشتہ

تتلی کے لبوں اور گلابوں کے بدن میں
رہتا ہے سدا چھوٹے سے اک راز کا رشتہ

ملنے سے گریزاں ہیں، نہ ملنے پہ خفا بھی
دم توڑتی چاہت ہے کس انداز کا رشتہ!

حلقۂ رنگ سے باہر دیکھوں
خود کو خوشبو میں سمو کر دیکھوں

اُس کو بینائی کے اندر دیکھوں
عمر بھر دیکھوں کہ پل بھر دیکھوں

کس کی نیندوں کے چُرا لائی رنگ
موجۂ زُلف کو چھُو کر دیکھوں

زرد برگد کے اکیلے پن میں
اپنی تنہائی کے منظر دیکھوں

موت کا ذائقہ لکھنے کے لئے
چند لمحوں کو ذرا مَر دیکھوں

کیسے کیسے تھے جزیرے خواب میں
بہہ گئے سب نیند کے سیلاب میں

لڑکیاں بیٹھی تھیں پاؤں ڈال کر
روشنی سی ہو گئی تالاب میں

جکڑے جانے کی تمنّا تیز تھی
آ گئے پھر حلقۂ گرداب میں

ڈوبتے سُورج کی نارنجی تھکن
تیرتی ہے دیدۂ خونناب میں

وہ تو میرے سامنے بیٹھا تھا ۔ پھر
کس کا چہرہ نقش تھا مہتاب میں!

مشترکہ دشمن کی بیٹی

ننھے سے اک چینی ریستوران کے اندر
میں اور میری نیشنلسٹ کولیگز
کیٹس کی نظموں جیسے دلآویز دھندلکے میں بیٹھی
سُوپ کے پیالے سے اُٹھتی، خوش لمس مہک کو
تن کی سیرابی میں بدلتا دیکھ رہی تھیں
باتیں "ہوا نہیں پڑھ سکتی"[1] تاج محل، میسور کے ریشم
اور بنارس کی ساری کے ذکر سے جھلمل کرتی
پاک د ہند سیاست تک آ نکلیں
پینسٹھ ــ اُس کے بعد اکہتر ــ جنگی قیدی ــ
امرتسر کا ٹی وی ــ
پاکستانی کلچر ــ محاذِ نو ــ خطرے کی گھنٹی ....

میری جوشیلی کولیگز
اس حملے پر بہت خفا تھیں

[1] مشہور نظم. THE WIND CAN NOT READ.

میں نے کچھ کہنا چاہا، تو
اُن کے منہ یوں بگڑ گئے تھے
جیسے سُوپ کے بدلے اُنہیں کونین کا رس پینے کو ملا ہو
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی بھی
میری طرف شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی
(شاید سینہ باسٹھ کا کوئی تیر ابھی تک اُس کے دل میں ترازو تھا!)

ریستوران کے نروز میں جیسے
ہائی بلڈ پریشر انساں کے جسم کی جیسی جھلّاہٹ در آئی تھی
یہ کیفیت کچھ لمحے رہتی
تو ہمارے ذہنوں کی شریانیں پھٹ جاتیں
لیکن اُس پل، آرکسٹرا خاموش ہُوا
اور لتاؔ کی رس ٹپکاتی، شہد آگیں آواز، کچھ ایسے اُبھری
جیسے حبس زدہ کمرے میں
دریا کے رُخ والی کھڑکی کھُلنے لگی ہو!
میں نے دیکھا
جسموں اور چہروں کے تناؤ پہ

اَن دیکھے ہاتھوں کی ٹھنڈک
پیار کی شبنم چھڑک رہی تھی
مسخ شدہ چہرے جیسے پھر سنور رہے تھے
میری نیشنلسٹ کولیگز
ہاتھوں کے پیالوں میں اپنی ٹھوڑیاں رکھے
ساکت و جامد بیٹھی تھیں
گیت کا جادو بول رہا تھا!
میز کے نیچے
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی کے
نرم گلابی پاؤں بھی
گیت کی ہمراہی میں تھرک رہے تھے!

مشترکہ دشمن کی بیٹی
مشترکہ محبوب کی صورت
اجلے ریشم لہجوں کی بانہیں پھیلائے
ہمیں سمیٹے
ناچ رہی تھی!

بارش ہُوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفّاک ہو گئے

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچّے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سُورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رُخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے

سُورج دماغ لوگ بھی ابلاغِ فکر میں
زلفِ شبِ فراق کے پیچاک ہو گئے

جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نمناک ہو گئے

ناٹک

رُت بدلی تو بھنوروں نے تتلی سے کہا
آج سے تم آزاد ہو
پروازوں کی ساری سمتیں تمہارے نام ہوئیں
جاؤ
جنگل کی مغرور ہوا کے ساتھ اڑو
بادل کے ہمراہ ستارے چھو آؤ
خوشبو کے بازو تھامو اور رقص کرو
رقص کرو
کہ اس موسم کے سُورج کی کرنوں کا تاج تمہارے سر ہے
لہراؤ
کہ ان راتوں کا چاند، تمہاری پیشانی پر اپنے ہاتھ سے دعا لکھے گا
گاؤ
ان لمحوں کی ہوائیں تم کو، تمہارے گیتوں پر سنگت دیں گی

پتے کرتے بجائیں گے
اور پھولوں کے ہاتھوں میں دف ہو گا!

تتلی، معصومانہ حیرت سے سرشار
سیہ شاخوں کے حلقے سے نکلی
صدیوں کے جکڑے ہوئے ریشم پر پھیلائے ـــ اور اُڑنے لگی
کھلی فضا کا ذائقہ چکھا
نرم ہوا کا گیت سُنا
ان دیکھے کہساروں کی قامت ناپی
روشنیوں کا لمس پیا
خوشبو کے ہر رنگ کو چھو کر دیکھا
لیکن رنگ، ہوا اور خوشبو کا وجدان ادھورا تھا
کہ رقص کا موسم ٹھہر گیا
رُت بدلی
اور سُورج کی کرنوں کا تاج پگھلنے لگا
چاند کے ہاتھ، دُعا کے حرف ہی بھول گئے
ہوا کے لب برفیلے سموں میں نیلے پڑ کر اپنی صدائیں کھو بیٹھے

پتّوں کی بانہوں کے سُر بے رنگ ہُوئے
اور تنہا رہ گئے پھول کے ہاتھ
برف کی لہر کے ہاتھوں، تتلی کو لوٹ آنے کا پیغام گیا
بھنورے شبنم کی زنجیریں لے کر دوڑے
اور بے چین پَروں میں اُن چکھی پروازوں کی آشفتہ پیاس جلا دی
اپنے کالے ناخونوں سے
تتلی کے پَر نوچ کے بولے —
احمق لڑکی
گھر واپس آجاؤ
ناٹک ختم ہُوا!

(خواتین کا عالمی سال)

خوشبو کی ترتیب، ہوا کے رقص میں ہے
میری نمو، میرے ہی جیسے شخص میں ہے

وہ میرا تن چھُوئے، من میں شعر اُگ آئے
پیڑ کی ہریالی بارش کے لمس میں ہے

سوچ کا رشتہ سانس سے ٹُوٹا جاتا ہے
لُو سے زیادہ جبرِ فضا کے حبس میں ہے

دن میں کیسی لگتی ہو گی، سوچتی ہوں
ندی کا سارا حُسن تو چاند کے عکس میں ہے

میری اچھائی تو سب کو اچھّی لگی
اُس کے پیار کا مرکز میرے نقص میں ہے

ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے
جس کی نیند کا سرچشمہ تک چرس میں ہے!

جنم

اب کے، دیوالی!
اُس کے گھر بھی
میرے نام کا دیا جلا
جو اپنے دروازوں پر، میری دستک کو
ہوا کا شور سمجھتا تھا
ملن کی رُت کو برہ کی بھور سمجھتا تھا
سپنے تک میں چھُو کر مجھ کو
خود کو چور سمجھتا تھا
چور نے مور کا جنم لیا ہے
سچی بار کے سندربن میں ناچ رہا ہے!

کیا ڈُوبتے ہوؤں کی صدائیں سمیٹتیں
سیلاب کی سماعتیں، آندھی کو رہن تھیں

کائی کی طرح لاشیں چٹانوں پہ اُگ گئیں
زرخیزیوں سے اپنی پریشان تھی زمیں

پیڑوں کا ظرف وہ کہ جڑیں تک نکال دیں
پانی کی پیاس ایسی کہ بجھتی نہ تھی کہیں

بچوں کے خواب پی کے بھی حلقوم خشک تھے
دریا کی تشنگی میں بڑی وحشتیں رہیں

بارش کے ہاتھ چُنتے رہے بستیوں سے خواب
نیندیں ہوائے تند کی موجوں کو بھا گئیں

ملبے سے ہر مکان کے نکلے ہوئے تھے ہاتھ
آندھی کو تھامنے کی بڑی کوششیں ہوئیں

تعویذ والے ہاتھ مگر مجھ کے پاس تھے
تہہ سے دعا لکھی ہوئی پیشانیاں ملیں

موجوں کے ساتھ سانپ بھی پھنکارنے لگے
جنگل کی دہشتیں بھی سمندر سے مل گئیں

بس رقص پانیوں کا تھا وحشت کے راگ پر
دریا کو سب دھنیں تو ہواؤں نے لکھ کے دیں!

سما کے ابر میں، برسات کی اُمنگ میں ہوں
ہَوا میں جذب ہوں، خوشبو کے انگ انگ میں ہوں

فضا میں تیر رہی ہوں، صدا کے رنگ میں ہوں
لہُو سے پوچھ رہی ہوں، یہ کس ترنگ میں ہوں

دھنک اُترتی نہیں میرے خون میں جب تک
میں اپنے جسم کی نیلی رگوں سے جنگ میں ہوں

بہار نے مری آنکھوں پہ پھُول باندھ دیے!
رہائی پاؤں تو کیسے، حصارِ رنگ میں ہوں

کھُلی فضا ہے، کھُلا آسماں بھی سامنے ہے
مگر یہ ڈر نہیں جاتا، ابھی سرنگ میں ہوں

ہَوا گزیدہ بنفشے کے پھُول کی مانند
پناہِ رنگ سے بچ کر، پناہِ سنگ میں ہوں

صدف میں اُتروں تو پھر میں گہُر بھی بن جاؤں
صدف سے پہلے مگر حلقۂ نہنگ میں ہوں

نارسائی

تتلیاں
فصیلِ شب عبور کر کے
میری کورکوکھ کے لیئے
پروں میں رنگ، آنکھ میں کرن لیے
کلائیوں سے ہوکے اب ہتھیلیوں تک آگئیں
مگر
مری تمام انگلیاں کٹی ہوئی ہیں !

رات کے زہر سے رسیلے ہیں
صبح کے ہونٹ کتنے نیلے ہیں!

ریت پر تیرتے جزیرے ملیں
پانیوں پر ہوا کے ٹیلے ہیں

ریزگی کا عذاب سہنا ہے
خوف سے سارے پیڑ پیلے ہیں

ہجر، سناٹا، پچھلے پہر کا چاند
خود سے ملنے کے کچھ وسیلے ہیں

دستِ خوشبو کرے مسیحائی
ناخنِ گُل نے زخم چھیلے ہیں

عشق سورج سے وہ بھی فرمائیں
جو شبِ تار کے رکھیلے ہیں

خوشبوئیں پھر بچھڑ نہ جائیں کہیں
ابھی آنچل ہُوا کے گیلے ہیں

کھڑکی دریا کے رُخ پہ جب سے کھُلی
فرش کمروں کے سیلے سیلے ہیں

زمیں کے حلقے سے نکلا تو چاند پچھتایا
کشش بچھانے لگا ہے ہر اگلا سیّارہ
میں پانیوں کی مسافر، وہ آسمانوں کا
کہاں سے ربط بڑھائیں کہ درمیاں ہے خلا
بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دُکھ تو ہوا
کھُلی فضا میں مگر سانس لینا اچھا لگا
جو صرف رُوح تھا فرقت میں بھی وصال میں بھی
اُسے بدن کے اثر سے رہا تو ہونا تھا
گئے دنوں میں جو تھا ذہن و جسم کی لذّت
وہی وصال طبیعت کا جبر بننے لگا
چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہَوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا!
برس سکے تو برس جائے اس گھڑی، ورنہ
بکھیر ڈالے گی بادل کے سارے خواب، ہوا

میں جگنوؤں کی طرح رات بھر کا چاند ہُوئی
ذرا سی دُھوپ نکل آئی ا.. ماند ہُوئی

حدودِ رقص سے آگے نکل گئی تھی کبھی
سو مورنی کی طرح عمر بھر کو راند ہُوئی

مہِ تمام : ابھی چھت پہ کون آیا تھا
کہ جس کے آگے تری روشنی بھی ماند ہُوئی

ٹکے کا چارہ نہ گیتاں کو زندگی میں دیا
جو مر گئی ہے تو سونے کے مول ناند ہُوئی

نہ پُوچھ، کیوں اسے جنگل کی رات اچھی لگی
وہ لڑکی جو کہ کبھی تیرے گھر کا چاند ہُوئی

وہ صورت آشنا میرا

میں اُس کے سامنے
چپ رہ کے بھی یوں بات کرتی ہوں
کہ آنکھوں کا کوئی حرف بدن نا آشنا
آلودۂ پیکر نہیں ہوتا
ہَوا کی لہر پہ جب گفتگو ہو
خواہ موسم پہ مرا اظہار ہو
یا ٹیلی وژن پہ
وہ میرے لمحۂ موجود کا دُکھ جان لیتا ہے
مجھے پہچان لیتا ہے
مری ہر بات کا چہرہ نہ چھُو کر ، دیکھنے پر بھی
وہ صورت آشنا میرا
مرے لہجوں کے پس منظر سمجھتا ہے !

اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے
برسات میں بھی یاد نہ جب اُن کو ہم آئے
مٹی کی مہک سانس کی خوشبو میں اُتر کر
بھیگے ہُوئے سبزے کی ترائی میں بلائے
دریا کی طرح موج میں آئی ہوئی برکھا
زردائی ہوئی رُت کو ہرا رنگ پلائے
بوندوں کی چھما چھم سے بدن کانپ رہا ہے
اور مست ہوا رقص کی لَے تیز کیے جائے
شاخیں ہیں تو وہ رقص میں، پتّے ہیں تو رم میں
پانی کا نشہ ہے کہ درختوں کو چڑھا جائے
ہر لہر کے پاؤں سے لپٹنے لگے گھنگھرو
بارش کی ہنسی تال پہ پازیب جو چھنکائے
انگور کی بیلوں پہ اُتر آئے ستارے
رکتی ہُوئی بارش نے بھی کیا رنگ دکھائے

بارش میں

زمین ہے
یا کہ کچے رنگوں کی ساری پہنے
گھنے درختوں کے نیچے کوئی شریر لڑکی
شریر تر پانیوں سے اپنا بدن چُرائے۔ چُرا نہ پائے!

ایک شعر

گھر کی ویرانی کی دوست
دیواروں پر اُگتی گھاس !

بے بسی

بارش نے زمیں پر پاؤں دھرا
خوشبو کھنکی، گھنگھرو چھنکا
لہرائی ہوا، بہکی برکھا
کیا جانیے کیا مٹی سے کہا
در آئی شریر میں اک ندیا
کس اور چلی، دیا دیا!
کس گھاٹ لگوں، مرے پڑیا
سارا جگ جل اور میں نیا

بسنت بہار کی نرم ہنسی

بسنت بہار کی نرم ہنسی
آنگن میں چھلکی
بھیگ گئی مری ساری
میگھ — پروا کی شوخی!
کیسے اپنا آپ سنبھالوں
آنچل سے تن ڈھانپوں — تو
زلفیں کھل جائیں
زلف سمیٹوں
تن چھلکے گا!

اشک آنکھ میں پھر اٹک رہا ہے
کنکر سا کوئی کھٹک رہا ہے

میں اُس کے خیال سے گریزاں
وہ میری صدا جھٹک رہا ہے

تحریر اُسی کی ہے، مگر دل
خط پڑھتے ہُوئے اٹک رہا ہے

ہیں فون پہ کس کے ساتھ باتیں
اور ذہن کہاں بھٹک رہا ہے

صدیوں سے سفر میں ہے سمندر
ساحل پہ تھکن ٹپک رہا ہے

اک چاند صلیبِ شاخِ گُل پر
بالی کی طرح لٹک رہا ہے!

سفر

بارش کا اک قطرہ آ کر
میری پلک سے اُلجھا
اور آنکھوں میں ڈوب گیا

دن ٹھہر جائے، مگر رات کٹے
کوئی صورت ہو کہ برسات کٹے

خوشبوئیں مجھ کو قلم کرتی گئیں
شاخ در شاخ مرے ہات کٹے

موجۂ گُل ہے کہ تلوار کوئی
درمیاں سے ہی مناجات کٹے

حرف کیوں اپنے گنوائیں جا کر
بات سے پہلے جہاں بات کٹے

چاند! آمل کے منائیں یہ شب
آج کی رات ترے سات کٹے

پُورے انسانوں میں گھُس آئے ہیں
سر کٹے، جسم کٹے، ذات کٹے

اِحتساب

ہوا — جو گندم کی پہلی خوشبو کے لمس سے لے کے
کڑوے بارود کی مہک تک
زمیں کے ہمراہ رقص میں تھی
گماں یہ ہوتا ہے
اس رفاقت سے تھک چکی ہے
اور اپنی پازیب اُتار کر
اجنبی زمینوں کی سرد بانہوں میں سو رہی ہے
فضا میں سنّاٹا دم بخود ہے !

ہوا کی خفگی ہی بے سبب ہے
کہ ابنِ آدم نے اپنے نیپام سے بھی بڑھ کر
کوئی نیا بم بنا لیا ہے ؟

ایک شعر

ہمارے عہد میں شاعر کے نرخ کیوں نہ بڑھیں
امیرِ شہر کو لاحق ہوئی سخن فہمی

سرگوشیٔ بہار سے خوشبو کے دَر کھُلے
کس اسم کے جمال سے بابِ ہُنر کھُلے

جب تنگ پا بہ گِل ہوں ہوائیں بھی قید ہوں
کیا اُس فضا میں پرچمِ زخمِ جگر کھُلے

خیمے سے دُور، شام ڈھلے، اجنبی جگہ
نکلی ہوں کس کی کھوج میں بے وقت، سر کھُلے

شاید کہ چاند بھُول پڑے راستہ کبھی
رکھتے ہیں اس اُمید پہ کچھ لوگ گھر کھُلے

وہ مجھ سے دُور خوش ہے؟ خفا ہے؟ اُداس ہے؟
کس حال میں ہے؟ کچھ تو مرا نامہ بر کھُلے

ہر رنگ میں وہ شخص نظر کو بھلا لگے
حد یہ کہ رُوٹھ جانا بھی اُس شوخ پر کھُلے

کھُل جائے کن ہواؤں سے ریشم بدن ہی
خلوت میں پھُول سے کبھی تتلی اگر کھُلے

راتیں تو قافلوں کی معیت میں کاٹ لیں
جب روشنی بٹی تو کوئی راہبر کھُلے

ہوا سے جنگ میں ہوں بے اماں ہوں
شکستہ کشتیوں پر بادباں ہوں

میں سورج کی طرح ہوں دھوپ اوڑھے
اور اپنے آپ پر خود سائباں ہوں

مجھے بارش کی چاہت نے ڈبویا
میں پختہ شہر کا کچا مکاں ہوں

خود اپنی چال اُلٹی چلنا چاہا ہوں
میں اپنے واسطے خود آسماں ہوں

دعائیں دے رہی ہوں دشمنوں کو
اور اک ہمدرد پر نامہرباں ہوں

پرندوں کو دعا سکھلا رہی ہوں
میں بستی چھوڑ، جنگل کی اذاں ہوں

ابھی تصویر میری کیا بنے گی
ابھی تو کینوس پر اک نشاں ہوں

خُدا سے

میں پذیرائی کے آداب سے واقف ہوں
مگر
اب کے برس، میرے گھر
یا تو برسات آئے
یا مری تنہائی !

مرجھانے لگی ہیں پھر خراشیں
آؤ کوئی زخم گر تلاشیں

ملبوس برہنہ کھیتیوں کے
پیراہن ابر سے تراشیں

بادل ہیں کہ نیلی طشتری میں
رقصاں ہیں سفیدیوں کی قاشیں

پیڑوں کی قبا ہی تھی قیامت
اور اُس پہ بہار کی تراشیں

تاروں کی تو چال اور ہی تھی
جیتا کیسے ہم اگرچہ تاشیں

ابہام ہے یا کہ شہر میرا
انسان ہیں یا حنوط لاشیں

سڑکوں پہ رواں یہ آدمی ہیں
یا نیند میں چل رہی لاشیں

ضِد

میں کیوں اُس کو فون کروں !
اُس کے بھی تو علم میں ہو گا
کل شب
موسم کی پہلی بارش تھی !

چاند میری طرح پگھلتا رہا　　نیند میں ساری رات چلتا رہا

جانے کس دُکھ سے دل گرفتہ تھا　　منہ پہ بادل کی راکھ ملتا رہا

میں تو پاؤں کے کانٹے چنتی رہی　　اور وہ راستہ بدلتا رہا

رات گلیوں میں جب بھٹکتی تھی　　کوئی تو تھا جو ساتھ چلتا رہا

موسمی بیل تھی میں سوکھ گئی　　وہ تناور درخت پھلتا رہا

سرد رُت میں مسافروں کے لئے　　پیڑ بن کر الاؤ جلتا رہا

ق

دل مرے تن کا پھول سا بچہ　　پتھروں کے نگر میں پلتا رہا

نیند ہی نیند میں کھلونے لیے

خواب ہی خواب میں بہلتا رہا!

آزمائش

ڈیڑھ برس کے بعد
اچانک
وقت نے اپنا آئینہ پن دکھلایا
بچھڑے ہوؤں کو مدِمقابل لے آیا
بہتی ہوا کے عکس بنانے والا ساحر
گونگی تصویروں کو اب آواز بھی دے!

آشیر باد

پھر مسیحائی دستگیر ہُوئی
چُن رہی ہے تمہارے اشکوں کو
کس محبّت سے یہ نئی لڑکی
میرے ہاتھوں کی کم سخن نرمی
دُکھ تمہارے نہ بانٹ پائی مگر
اس کے ہاتھوں کی مہربانی کو
میری کم ساز آرزو کی دعا
اور یہ بھی کہ اس کی چارہ گری
عمر بھر ایسے سر اُٹھا کے چلے
میری صورت کبھی نہ کہلائے
زخم پر ایک وقت کی پٹّی !

پروردہ

لوگ کہتے ہیں اِن دنوں چُپ ہے
میرا قاتل —
کہ اُس کے خنجر کو
دھونے والی کنیز
چُھپ چُھپ کر
اب لہو کو زباں سے چاٹتی ہے !

کہاں آرام لمحہ بھر رہا ہے
سفر، میرا تعاقب کر رہا ہے

رہی ہوں بے اماں موسم کی زد پر
ہتھیلی پر ہوا کی، سر رہا ہے

میں اک نوزائیدہ چڑیا ہوں لیکن
پرانا باز، مجھ سے ڈر رہا ہے

پذیرائی کو میری شہرِ گل میں
صبا کے ہاتھ میں پتھر رہا ہے

ہوائیں چھو کے رستہ بھول جائیں
مرے تن میں کوئی منتر رہا ہے

میں اپنے آپ کو ڈسنے لگی ہوں
مجھے اب زہر اچھا کر رہا ہے

کھلونے پا لیے ہیں میں نے لیکن
مرے اندر کا بچہ مر رہا ہے

نہ قرضِ ناخنِ گُل، نام کو، لوں
ہوا ہوں، اپنی گرہیں آپ کھولوں

تری خوشبو بچھڑ جانے سے پہلے
میں اپنے آپ میں تجھ کو سمو لوں

کُھلی آنکھوں سے سپنے قرض لے کر
تری تنہائیوں میں رنگ گھولوں

ملے گی آنسوؤں سے تن کو ٹھنڈک
بڑی لُو ہے، ذرا آنچل بھگو لوں

وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا، اس سے نہ بولوں

میں چڑیا کی طرح' دن بھر تھکی ہوں
ہوئی ہے شام تو کچھ دیر سو لوں

چلوں مقتل سے اپنے شام' لیکن
میں پہلے اپنے پیاروں کو تو رو لوں

مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے
سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں

عمر بھر کے لئے اب تو سوئی کی سوئی ہی معصوم شہزادیاں رہ گئیں
نیند چُنتے ہُوئے ہاتھ ہی تھک گئے وہ بھی جب آنکھ کی سوئیاں رہ گئیں

لوگ گلیوں سے ہو کر گزرتے رہے، کوئی ٹھٹھکا، نہ ٹھہرا، نہ واپس ہوا
اَدھ کھُلی کھڑکیوں سے لگی، شام سے راہ تکتی ہُوئی لڑکیاں رہ گئیں

پاؤں چھُو کر پجاری الگ ہو گئے، نیم تاریک مندر کی تنہائی میں
آگ بنتی ہُوئی تن کی نوخیز، خوشبو سمیٹے ہُوئے دیویاں رہ گئیں

وہ ہوا تھی کہ کچّے مکانوں کی چھت اُڑ گئی اور مکیں لاپتہ ہو گئے
اب تو موسم کے ہاتھوں (خزاں میں) اُجڑنے کو بس خواب کی بستیاں رہ گئیں

آخر کار لو وہ بھی رخصت ہوا' ساری سکھیاں بھی اب اپنے گھر کی ہوئیں
زندگی بھر کو فنکار سے گفتگو کے لیے صرف تنہائیاں رہ گئیں

شہرِ گل میں ہواؤں نے چاروں طرف' اس قدر ریشمیں جال پھیلا دیے
تھرتھراتے پروں میں شکستہ اڑانیں سمیٹے ہوئے تتلیاں رہ گئیں

اجنبی شہر کی اوّلیں شام ڈھلنے لگی' پُرسہ دینے جو آئے ۔ گئے
جلتے خیموں کی بجھتی ہوئی راکھ پر بال کھولے ہوئے بیبیاں رہ گئیں

جانے پھر اگلی صدا کس کی تھی
نیند نے آنکھ پہ دستک دی تھی

موج در موج ستارے نکلے
جھیل میں چاند کرن اُتری تھی

پریاں آئی تھیں کہانی کہنے
چاندنی رات نے لوری دی تھی

بات خوشبو کی طرح پھیل گئی
پیرہن میرا شکن تیری تھی

آنکھ کو یاد ہے وہ پل اب بھی
نیند جب پہلے پہل ٹوٹی تھی

عشق تو خیر تھا اندھا لڑکا
حُسن کو کون سی مجبوری تھی

کیوں وہ بے سمت ہوا جب میں نے
اُس کے بازو پہ دعا باندھی تھی

گِلہ

اے خُدا
میری آواز سے ساحری چھین کر
تو نے سانپوں کی بستی میں کیوں مجھ کو پیدا کیا!

دُکھ نوشتہ ہے تو آندھی کو لکھا! آہستہ
اے خدا اب کے چلے زرد ہَوا ، آہستہ

خواب جل جائیں مری چشمِ تمنا بجھ جائے
بس ہتھیلی سے اُڑے رنگِ حنا ، آہستہ!

زخم ہی کھولنے آئی ہے تو عجلت کیسی
چھُو مرے جسم کو ، اے بادِ صبا ! آہستہ!

ٹوٹنے اور بکھرنے کا کوئی موسم ہو
پھول کی ایک دُعا — موج ہوا! آہستہ

جانتی ہوں کہ بچھڑنا تری مجبوری ہے
پر مری جان ! ملے مجھ کو سزا آہستہ

مری چاہت میں بھی اب سوچ کا رنگ آنے لگا
اور ترا پیار بھی شدّت میں ہُوا آہستہ

نیند پر جال سے پڑنے لگے آوازوں کے
اور پھر ہونے لگی تیری صدا آہستہ

رات جب پھول کے رخسار پہ دھیرے سے جُھکی
"چاند نے جُھک کے کہا، اور ذرا آہستہ!"

منظر ہے وہی ٹھٹھک رہی ہوں
حیرت سے پلک جھپک رہی ہوں

یہ تُو ہے کہ میرا واہمہ ہے !
بند آنکھوں سے تجھ کو تک رہی ہوں

جیسے کہ کبھی نہ تھا تعارف
یُوں ملتے ہُوئے جھجک رہی ہوں

پہچان ! میں تیری روشنی ہوں
اور تیری پلک پلک رہی ہوں

کیا چین ملا ہے — سر جو اُس کے
شانوں پہ رکھے سسک رہی ہوں

پتھر پہ کھلی، پہ چشمِ گُل میں
کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہوں

جگنو کہیں تھک کے گر چکا ہے
جنگل میں کہاں بھٹک رہی ہوں

گڑیا مری سوچ کی چھنی کیسا
بچّی کی طرح بلک رہی ہوں

اک عمر ہُوئی ہے خود سے لڑتے
اندر سے تمام تھک رہی ہوں

رس پھر سے جڑوں میں جا رہا ہے
میں شاخ پہ کب سے پک رہی ہوں

تخلیقِ جمالِ فن کا لمحہ!
کلیوں کی طرح چٹک رہی ہوں

ڈھونڈا کیے ہاتھ جگنوؤں کے
میلے سے بچھڑ کے آنسوؤں کے

اک رات کِھلا تھا اُس کا وعدہ
آنگن میں ہجوم خوشبوؤں کے!

شہروں سے ہوا جو ہو کے آئی
رَم چھِننے لگے ہیں آہوؤں کے

کس بات پہ کائنات تج دیں
کھُلتے نہیں بھید سادھوؤں کے

تنہا مری ذات دستِ شب میں
اطراف میں خیمے بدوؤں کے!

یہ بول ہوا کے لب پہ ہیں — یا
منتر ہیں قدیم جادوؤں کے!

اب کیا ہے جو تیرے پاس آؤں
کس مان پہ تجھ کو آزماؤں

زخم اب کے تو سامنے سے کھاؤں
دشمن سے نہ دوستی بڑھاؤں

تتلی کی طرح جو اُڑ چکا ہے
وہ لمحہ کہاں سے کھوج لاؤں

گروی ہیں سماعتیں بھی اب تو
کیا تیری صدا کو منہ دکھاؤں

اے میرے لیے نہ دُکھنے والے!
کیسے ترے دُکھ سمیٹ لاؤں

یوں تیری شناخت مجھ میں اُترے
پہچان تک اپنی بھُول جاؤں

تیرے ہی بھلے کو چاہتی ہوں
میں تجھ کو کبھی نہ یاد آؤں

قامت سے بڑی صلیب پا کر
دُکھ کو کیوں کر گلے لگاؤں

دیوار سے بیل بڑھ گئی ہے
پھر کیوں نہ ہوا میں پھیل جاؤں

من تھکنے لگا ہے تن سمیٹے
بارش کی ہوا میں بن سمیٹے

ایسا نہ ہو، چاند بھید پالے
پیراہنِ گُل شکن سمیٹے

سوتی رہی آنکھ دن چڑھے تک
دُلہن کی طرح تھکن سمیٹے

گزرا ہے چمن سے کون ایسا
بیٹھی ہے ہوا بدن سمیٹے

شاخوں نے کلی کو بددعا دی
بارش ترا بھولپن سمیٹے

آنکھوں کے طویل رتجگوں پر
چاند آیا بھی تو گہن سمیٹے

احوال مرا وہ پوچھتا تھا
لہجے میں بڑی چبھن سمیٹے

اندر سے شکست وہ بھی نکلا
لیکن وہی بانکپن سمیٹے

شام آئے تو ہم بھی گھر کو لوٹیں
چڑیوں کی طرح تھکن سمیٹے

خود جنگ سے دست کش تھے ہم لوگ
جذبات میں ایک رن سمیٹے

آنکھوں کے چراغ ہم بجھا دیں
سورج بھی مگر کرن سمیٹے

کس پیار سے مل رہے ہیں کچھ لوگ
چمکیلے بدن میں پھن سمیٹے

بکھر ہونے لگی ہوں ریزہ ریزہ
آئے — مجھے میرا فن سمیٹے

غیروں کے لئے بکھر گئی تھی
اب مجھ کو مرا وطن سمیٹے

پھول آئے، نہ برگ تر ہی ٹھہرے
دُکھ پیڑ کے بے ثمر ہی ٹھہرے

ہیں تیز بہت ہوا کے ناخن
خوشبو سے کہو کہ گھر ہی ٹھہرے

کوئی تو بنے خزاں کا ساتھی
پتّہ نہ سہی، شجر ہی ٹھہرے

اس شہرِ سخن فروشگاں میں
ہم جیسے تو بے ہنر ہی ٹھہرے

اُن چکھی اُڑان کی بھی قیمت
آخر مرے بال و پر ہی ٹھہرے

روغن سے چمک اُٹھے تو مجھ سے
اچھّے مرے بام و در ہی ٹھہرے

کچھ دیر کو آنکھ رنگ چھُو لے
تتلی پہ اگر نظر ہی ٹھہرے

وہ شہر میں ہے، یہی بہت ہے
کس نے کہا، میرے گھر ہی ٹھہرے

چاند اُس کے نگر میں کیا رُکا ہے
تارے بھی تمام اُدھر ہی ٹھہرے

ہم خود ہی تھے سوختہ مقدّر
ہاں! آپ ستارہ گر ہی ٹھہرے

میرے لئے منتظر ہو وہ بھی
چاہے سرِ رہگزر ہی ٹھہرے

پازیب سے پیار تھا سو میرے
پاؤں میں سدا بھنور ہی ٹھہرے

اب کیسی پردہ داری، خبر عام ہو چکی
ماں کی ردا تو، دن ہُوئے، نیلام ہو چکی

اب آسماں سے چادرِ شب آئے بھی تو کیا
بے چادری زمین پہ الزام ہو چکی

اُجڑے ہُوئے دیار پہ پھر کیوں نگاہ ہے
اس کشت پر تو بارشِ اکرام ہو چکی

سورج بھی اُس کو ڈھونڈ کے واپس چلا گیا
اب ہم بھی گھر کو لَوٹ چلیں، شام ہو چکی

شملے سنبھالتے ہی رہے مصلحت پسند
ہونا تھا جس کو پیار میں بدنام ہو چکی

آنکھیں ہیں اور صبح تلک تیرا انتظار
مشعل بدست رات ترے نام ہو چکی

کوہِ ندا سے بھی سخن اُترے اگر، تو کیا
ناسامعوں میں حرمتِ الہام ہو چکی!

پانی پر بھی زادِ سفر میں پیاس تو لیتے ہیں
چاہنے والے ایک دفعہ بن باس تو لیتے ہیں

ایک ہی شہر میں رہ کر جن کو اذنِ دید نہ ہو
یہی بہت ہے ایک ہوا میں سانس تو لیتے ہیں

رستہ کتنا دیکھا ہوا ہو، پھر بھی شاہ سوار
ایڑ لگا کر اپنے ہاتھ میں راس تو لیتے ہیں

پھر آنگن دیواروں کی اونچائی میں گم ہوں گے
پہلے پہلے گھر اپنوں کے پاس تو لیتے ہیں

یہی غنیمت ہے کہ بچے خالی ہاتھ نہیں ہیں
اپنے پُرکھوں سے دُکھ کی میراث تو لیتے ہیں

جگا سکے نہ ترے لب، لکیر ایسی تھی
ہمارے بخت کی ریکھا بھی میر ایسی تھی

یہ ہاتھ چومے گئے، پھر بھی بے گلاب رہے
جو رُت بھی آئی، خزاں کے سفیر ایسی تھی

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اُسے دیتی، امیر ایسی تھی

شہادتیں مرے حق میں تمام جاتی تھیں
مگر خموش تھے منصف، نظیر ایسی تھی

کُتر کے جال بھی صیّاد کی رضا کے بغیر
تمام عمر نہ اُڑتی، اسیر ایسی تھی

پھر اس کے بعد نہ دیکھے وصال کے موسم
جُدائیوں کی گھڑی چشم گیر ایسی تھی

بس اک نگاہ مجھے دیکھتا، چلا جاتا
اُس آدمی کی محبت فقیر ایسی تھی

ردا کے ساتھ لٹیرے کو زادِ رہ بھی دیا
تری فراخ دلی میرے دیر ایسی تھی

کبھی نہ چاہنے والوں کا خوں بہا مانگا
نگارِ شہرِ سخن بے ضمیر ایسی تھی

میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر، اے خدا! لگ گئی
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بد دعا لگ گئی

ایک بازو بریدہ شکستہ بدن قوم کے باب میں
زندگی کا یقیں کس کو تھا، بس یہ کہیے، دوا لگ گئی

جھوٹ کے شہر میں آئینہ کیا لگا، سنگ اٹھائے ہوئے
آئینہ ساز کی کھوج میں جیسے خلقِ خدا لگ گئی

جنگلوں کے سفر میں تو آسیب سے بچ گئی تھی، مگر
شہر والوں میں آتے ہی پیچھے یہ کیسی بلا لگ گئی

نیم تاریک تنہائی میں سرخ پھولوں کا بن کھل اٹھا
ہجر کی زرد دیوار پر تیری تصویر کیا لگ گئی

وہ جو پہلے گئے تھے، ہمیں اُن کی فرقت ہی کچھ کم نہ تھی
جان! کیا تجھ کو بھی شہرِ نامہرباں کی ہوا لگ گئی؟

دو قدم چل کے ہی چھاؤں کی آرزو سر اُٹھانے لگی
میرے دل کو بھی شاید ترے حوصلوں کی ادا لگ گئی

میز سے جانے والوں کی تصویر کب ہٹ سکی تھی مگر
درد بھی جب تھما، آنکھ بھی جب ذرا لگ گئی!

وہی پرند کہ کل گوشہ گیر ایسا تھا
پلک جھپکتے، ہوا میں لکیر ایسا تھا

اسے تو دوست کے ہاتھوں کی سُوجھ بُوجھ بھی تھی
خطا نہ ہوتا کسی طور، تیر ایسا تھا

پیام دینے کا موسم نہ ہم نوا پاکر
پلٹ گیا دبے پاؤں، سفیر ایسا تھا

کسی بھی شاخ کے پیچھے پناہ لیتی میں
مجھے وہ توڑ ہی لیتا، شریر ایسا تھا

ہنسی کے رنگ بہت مہربان تھے لیکن
اداسیوں سے ہی نبھتی، خمیر ایسا تھا

ترا کمال کہ پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں
غزالِ شوق کہاں کا اسیر ایسا تھا!

ایک ننھّی سی امّید

اب تو شہر میں لوٹ آئے ہو
اب تو سب لمحے اپنے ہیں
کیا اب بھی کم فرصت ہو؟
ہاں — لمحوں کی تیزروی نے مجھ کو بھی سمجھایا ہے
دن کے شور میں اپنی صدا گم رہتی ہے
لیکن شام کا لہجہ تو سرگوشی ہے
جم خانے کی گہری رات کی انگوری بانہوں میں آنے سے پہلے
جب وہسکی آنکھوں میں ستارے بھر دے
اور سرشاری
بھولے بھٹکے رستوں کے وہ سارے چراغ جلا دے
جو تم ہوا سے لڑ کر روشن رکھا کرتے تھے
کیا کوئی کرن — ننھی سی کرن — میری ہو گی؟

گوری کرت سنگھار

بال بال موتی چمکائے
روم روم مہکار
مانگ سیندور کی سندرتا سے
چمکے چندن وار
جُوڑے میں جوہی کی بینی
بانہہ میں ہار سنگھار
کان میں جگ مگ بالی پتّہ
گلے میں جگنو ہار
صندل ایسی پیشانی پر
بندیا لائی بہار
سبز کٹارا سی آنکھوں میں
کجرے کی دو دھار
گالوں کی سُرخی میں جھلکے
ہردے کا اقرار

ہونٹ پہ کچھ پھولوں کی لالی
کچھ ساجن کے کار
کسا ہُوا کیسری شلوکا
چُنری دھاری دار
ہاتھوں کی اک اک چُوڑی میں
موہن کی جھنکار
سہج چلے' پھر بھی پائل میں
بولے پی کا پیار
اپنا آپ درپن میں دیکھے
اور شرمائے نار
نار کے رُوپ کو انگ لگائے
دھڑک رہا سنسار

تتلیوں کی بے چینی آ بسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں، اور پھر ہواؤں میں

جن کے کھیت اور آنگن ایک ساتھ اُجڑتے ہیں
کیسے حوصلے ہوں گے اُن غریب ماؤں میں

صورتِ رفو کرتے، سر نہ یوں کھُلا رکھتے
جوڑ کب نہیں ہوتے، ماؤں کی رداؤں میں

آنسوؤں میں کٹ کٹ کر کتنے خواب گرتے ہیں
اک جوان کی میّت آ رہی ہے گاؤں میں

اب تو ٹوٹی کشتی بھی آگ سے بچاتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنا بخت آزماؤں میں

ابر کی طرح ہے وہ یوں نہ چھُو سکوں لیکن
ہاتھ جب بھی پھیلائے آ گیا دعاؤں میں

جگنوؤں کی شمعیں بھی راستے میں روشن ہیں
سانپ ہی نہیں ہوتے ذات کی گپھاؤں میں

صرف اس تکبّر میں اُس نے مجھ کو جیتا تھا
ذکر ہو نہ اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

کوچ کی تمنّا میں پاؤں تھک گئے لیکن
سمت طے نہیں ہوتی پیارے رہنماؤں میں

اپنی غم گساری کو مشتہر نہیں کرتے
اتنا ظرف ہوتا ہے درد آشناؤں میں

اب تو ہجر کے دُکھ میں ساری عمر جلنا ہے
پہلے کیا پناہیں تھیں، مہرباں چتاؤں میں

ساز و رخت بھجوادیں حدِّ شہر سے باہر
پھر سُرنگ ڈالیں گے ہم محل سراؤں میں

شوقِ رقص سے جب تک اُنگلیاں نہیں کُھلتیں
پاؤں سے ہواؤں کے، بیڑیاں نہیں کُھلتیں

پیڑ کو دعا دے کر کٹ گئی بہاروں سے
پھول اتنے بڑھ آئے، کھڑکیاں نہیں کُھلتیں

پھول بن کی سیروں میں اور کون شامل تھا
شوخیٔ صبا سے تو بالیاں نہیں کُھلتیں

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہیئے، جاناں!
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کُھلتیں

کوئی موجۂ شیریں چُوم کر جگائے گی!
سورجوں کے نیزوں سے سیپیاں نہیں کُھلتیں

ماں سے کیا کہیں گی دُکھ ہجر کا، کہ خود پر بھی
اتنی چھوٹی عمروں کی بچیاں نہیں کھلتیں

شاخ شاخ سرگرداں، کس کی جستجو میں ہیں
کون سے سفر میں ہیں، تتلیاں نہیں کھلتیں

آدھی رات کی چُپ میں کس کی چاپ اُبھرتی ہے
چھت پہ کون آتا ہے، سیڑھیاں نہیں کھلتیں

پانیوں کے چڑھنے تک حال کہہ سکیں اور پھر
کیا قیامتیں گزریں، بستیاں نہیں کھلتیں

مٹی کی گواہی خوں سے بڑھ کر
آتی ہے عجب گھڑی وفا پر

کس خاک کی کوکھ سے جنم لیں
آئے ہیں جو اپنے بیج کھو کر

کانٹا بھی یہاں کا برگِ تر ہے
باہر کی کلی ببول تجھ پر

قلموں سے لگے ہوئے شجر ہم
پل بھر میں ہوں کس طرح ثمر ور

کچھ پیڑ زمین چاہتے ہیں
بیلیں تو نہیں اُگیں ہوا پر

اِس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر

پتھّر بھی بہت حسیں ہیں لیکن
مٹی سے ہی بن سکیں گے کچھ گھر

ہر عشق گواہ ڈھونڈتا ہے
جیسے کہ نہیں یقین خود پر

بس اُن کے لیے نہیں جزیرہ
پَیر آئے جو کھولتے سمندر

بچپنا

ننھا شگوفہ
شاخ سے ہاتھ چھڑا کر
ہَوا کی بات میں آ کر
بارش کے میلے میں گیا
اور اپنے آپ سے بچھڑ گیا!

نذرِ حضرت امیر خسروؔ

(پوربی)

پردیسی کب آؤ گے ؟
سورج ڈوبا شام ہو گئی
تن میں چنبیلی پھولی
من میں آگ لگانے والے
میں کب تجھ کو بھولی
کب تک آنکھ چراؤ گے ؟
پردیسی کب آؤ گے ؟
سانجھ کی چھاؤں میں تیری چھایا
ڈھونڈتی جائے داسی
بھرے ماگھ میں کھوجے تجھ کو
تن درشن کی پیاسی
جیون بھر ترساؤ گے
پردیسی، کب آؤ گے ؟

بھیروں ٹھاٹھ نے انگ بنایا
وادی سُر — گندھار
سموادی کومل دھا رنگ دے
شدھ مدھم سنگھار
تم کب تِلک لگاؤ گے؟
پردیسی، کب آؤ گے؟

ہاتھ کا پھول، نہ گلے کی مالا
مانگ کا سرخ سیندور
سب کے رنگ ہیں پھیکے پڑنے
ساجن جب تک دُور
رُوپ نہ میرا سجاؤ گے؟
پردیسی کب آؤ گے؟

ہر آہٹ پر کھڑکی کھولی
ہر دستک پر آنکھ
چاند نہ میرے آنگن اُترا
سپنے ہو گئے راکھ
ساری عمر جلاؤ گے؟
پردیسی، کب آؤ گے؟

رقص

آئینے سے فرش پر،
ٹوٹے بدن کا عکس۔
آدھے چاند کی صورت لرزتا ہے
ہوا کے دامن کی نرم موسیقی
خنک تاریکیوں میں
چاہنے والوں کی سرگوشی کی صورت بہہ رہی ہے
اور ہجوم ناشناساں سے پرے
نسبتاً کم بولتی تنہائی میں
اجنبی ساتھی نے، میرے دل کی ویرانی کا ماتھا چوم کر
مجھ کو یوں تھاما ہوا ہے

جیسے میرے سارے دُکھ اب اُس کے شانوں کے لیے ہیں!
دونوں آنکھیں بند کر کے
میں نے بھی ان بازوؤں پر تھک کے سر یوں رکھ دیا ہے
جیسے غربت میں اچانک چھاؤں پا کر راہ گم گشتہ مسافر پیڑ
سے سر ٹیک دے!

خواب صورت روشنی
اور ساز کی دلدار لَے
اُس کی سانسوں سے گزر کر
میرے خوں کی گردشوں میں سبز تارے بو رہی ہے
رات کی آنکھوں کے ڈورے بھی گلابی ہو رہے ہیں
اُس کے سینے سے لگی
میں کنول کے پھول کی وارفتگی سے
سرخوشی کی جھیل پر آہستہ آہستہ قدم یوں رکھ رہی ہوں
جیسے میرے پاؤں کچی نیند میں ہوں اور ذرا بھاری قدم رکھے
تو پانی ٹوٹ جائے گا

شکستہ روح پر سے غم کے سارے پیرہن
ایک اِک کر کے اُترتے جا رہے ہیں

لمحہ لمحہ
میں زمیں سے دُور ہوتی جا رہی ہوں
اب ہَوا میں پاؤں ہیں
اب بادلوں پر
اب ستاروں کے قریب
اب ستاروں سے بھی اُوپر ، .....
اور اوپر ..... اور اوپر ..... اور .....

ایک بُری عورت

وہ اگرچہ مطربہ ہے
لیکن اُس کے دامِ صوت سے زیادہ
شہر اُس کے جسم کا اسیر ہے
وہ آگ میں گلاب گوندھ کر کمالِ آذری سے پہلوی تراشں
پانے والا جسم

جس کو آفتاب کی کرن جہاں سے چومتی ہے
رنگ کی پھوار پھوٹتی ہے !
اُس کے حسنِ بے پناہ کی چمک
کسی قدیم لوک داستان کے جال کی طرح
تمام عمر لاشعور کو اسیرِ رنگ رکھتی ہے !
گئے زمانوں میں کسی پری کو مُڑ کے دیکھنے سے لوگ
باقی عمر قیدِ سنگ کاٹتے تھے
یاں — سزائے بازدید آگ ہے !
یہ آزمائشِ شکیبِ ناصحاں و امتحانِ زُہدِ واعظاں
دریچۂ مراد کھول کر ذرا جُھکے
تو شہرِ عاشقاں کے سارے سبز خط
خدائے تن سے
شب عذار ہونے کی دعا کریں

جواں لہو کا ذکر کیا
یہ آتشہ تو
پیرِ سال خوردہ کو صبح خیز کر دے !

شہر اس کی دلکشی کے بوجھ سے چیخ رہا ہے
کیا عجیب حسن ہے '
کہ جس سے ڈر کے مائیں اپنی کوکھ جائیوں کو '
کوڑھ صورتی کی بددعائیں دے رہی ہیں
کنواریاں تو کیا
کہ کھیلی کھائی عورتیں بھی جس کے سائے سے پناہ مانگتی ہیں
بیاہتا دلوں میں اس کا حُسن خوف بن کے یوں دھڑکتا ہے
کہ گھر کے مرد شام تک نہ لوٹ آئیں تو
وفا شعار بیبیاں دعائے نور پڑھنے لگتی ہیں !

کوئی برس نہیں گیا،
کہ اس کے قرب کی سزائیں
شہر کے سبھی قداں
نہ قامتِ صلیب کی قبا ہوئے
وہ نہر جس پہ ہر سحر یہ خوش جمال بال دھونے جاتی ہے
اُسے فقیہہِ شہر نے بخس قرار دے دیا
تمام نیک مرد اس سے خوف کھاتے ہیں
اگر بکارِ خسروی
کبھی کسی کو اس کی راندۂ جہاں گلی سے ہو کے جانا ہو
تو سب کلاہ دار،
اپنی عصمتیں بچائے یوں نکلتے ہیں
کہ جیسے اس گلی کی ساری کھڑکیاں
زنانِ مصر کی طرح سے
اُن کے پچھلے دامنوں کو کھینچنے لگی ہیں

یہ گئی اماوسوں کا ذکر ہے
کہ ایک شام گھر کو لوٹتے ہوئے میں راستہ بھٹک گئی
مری تلاش مجھ کو جنگلوں میں لا کے تھک گئی
میں راہ کھوجتی ہی رہ گئی
اس ابتلا میں چاند سبز چشم ہو چکا تھا
جگنوؤں سے کیا امید باندھتی
مہیب شب ہراس بن کے جسم و جاں پہ یوں اُتر رہی تھی
جیسے میرے رُوئیں رُوئیں میں
کسی بلا کا ہاتھ سرسرا رہا ہو
زندگی میں — خامشی سے اتنا ڈر کبھی نہیں لگا :
کوئی پرند پاؤں بھی بدلتا تھا تو نبض ڈوب جاتی تھی
میں ایک آسماں چشیدہ پیڑ کے سیہ تنے سے سر لگائے،
تازہ پتّے کی طرح لرز رہی تھی

ناگہاں کسی گھنیری شاخ کو ہٹا کے
روشنی کے دو الاؤ یوں دہک اُٹھے
کہ ان کی آنچ میرے ناخنوں تک آ رہی تھی —
ایک جست —
اور قریب تھا کہ ہانپتی ہوئی بلا
مری رگِ گلو میں اپنے دانت گاڑتی
کہ دفعتاً کسی درخت کے عقب میں چوڑیاں بجیں
لباسِ شب کی سلوٹوں میں چرمرائے زرد پتوں کی ہری کہانیاں لیے
وصالِ تشنہ کا ملال آنکھ میں
لبوں پہ ورم، گال پر خراش
سنبلیں کھلے ہوئے دراز گیسوؤں میں آنکھ مارتا ہُوا گلاب ٭

اور چھلی ہوئی سپید کہنیوں میں اوس اور دھول کی مِلی جلی بنسی لیے
وہی بلا، وہی نجس، وہی بدن دریدہ فاحشہ
تڑپ کے آئی — اور —
میرے اور بھیڑیے کے درمیان ڈٹ گئی !

کیا ذکرِ برگ و بار، یہاں پیڑ ہل چکا
اب آئے چارہ ساز کہ جب زہر کھل چکا

جب سوزنِ ہوا میں پرویا ہو تارِ خوں
اے چشمِ انتظار! ترا زخم سِل چکا

آنکھوں پہ آج چاند نے افشاں چُنی تو کیا
تازہ سا ایک خواب تو مٹی میں مِل چکا

آئے ہوائے زرد کہ طوفان برف کا
مٹی کی گود کر کے ہری، پھول کھل چکا

بارش نے ریشے ریشے میں رس بھر دیا ہے اور
خوش ہے کہ یوں حسابِ کرم ہائے گل چکا
چھو کر ہی آئیں منزلِ اُمید ہاتھ سے
کیا راستے سے لوٹنا جب پاؤں چِھل چکا
اُس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفیق بھی دشمن سے مِل چکا!

دُعا

چاندنی،
اُس دریچے کو چُھو کر
مرے نیم روشن جھروکے میں آئے، نہ آئے
مگر
میری پلکوں کی تقدیر سے نیند چنتی رہے
اور اُس آنکھ کے خواب بُنتی رہے !

صد برگ

پروین شاکر

امّی کے نام

صد برگ تک آتے آتے منظرنامہ بدل چکا تھا ——
میری زندگی کا بھی اور اُس سرزمین کا بھی جس کے ہونے سے میرا ہونا ہے —— رزم گاہِ جاں میں ہم نے کئی معرکے ایک ساتھ ہارے اور بہت سے خوابوں پر اکٹھے مٹی برابر کی —— شامِ غریباں کی پینٹنگ کیسی بنے گی؟ کوفۂ شہر کے منارے سبز تو نہیں ہو سکتے نا
سچائی جب مخبروں میں گھر جائے تو گفتگو علامتوں کے سپرد کر دی جاتی ہے ——

ایک بار پھر —— صد برگ اور آپ اکٹھے ہو رہے ہیں!

جون ۱۹۸۸ء —— کراچی
جون ۱۹۹۰ء —— اسلام آباد

پروین شاکر

صدبرگ

رزقِ ہوا.....

زندگی کے دشتِ بلا میں سچائی جب اپنے وقتِ عصر کو پہنچ جائے تو کون و مکاں میں صرف ایک پکار باقی رہ جاتی ہے...... ہل من ناصرٍ ینصرنا...... ہل من ناصرٍ ینصرنا......

لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نہر منسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خودداری، دینار عزتِ نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ بکیں، وہاں نیکی کی نصرت کو کون آئے؟ وہاں تو سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں...... اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے، مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ انھوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا، اور اب مجھے دیوار میں چن دینا اُن کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا! مگر وہ اپنی بھول سے بے خبر نہیں، سو اب میں ہوں اور ہونے کی مجبوری کا یہ اندھا کنواں جس کے گرد گھومتے گھومتے میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہیں اور آنکھیں پانی کی ــــ کیونکہ میں نے اور لڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کر دیا تھا! اور انکار کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا!

ہر انکار پہ میرے جسم میں ایک میخ کا اور اضافہ ہو گیا ــــ مگر میخیں ٹھونکنے والوں نے میری آنکھوں سے کوئی تعرض نہ کیا ــــ شاید وہ جانتے تھے کہ انھیں بجھانے سے میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، یا پھر اپنی سفاکیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ ایک گونگے گواہ کے طالب تھے اور میں حیران ہوں کہ اس گواہی سے میری آنکھیں اب تک پتھرائی کیوں نہیں!

سنگینوں میں پروئے ہوئے بچے اور نیزوں پہ ٹنگے ہوئے جوان سر، میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے ــــ اور میں قتل ہونے والوں کے نام تک نہیں پوچھ سکی ــــ کہ ایسا کرنے میں وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں۔ مرگِ انبوہ تو یوں بھی جشن کا سماں رکھتی ہے ــــ سو تماشا دیکھنے والوں میں میری آنکھیں بھی شامل رہیں!

بستی میں برفباری ہوئی، تو لوگوں نے اپنے ہاتھ تاپنے کے لیے گھر ہی جلا دیے اور جب تمام بستی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی، تو سارے ہاتھ بند تھے، مگر کسی کو سورۂ ابراہیم یاد نہ تھی!

بہار کی دھوپ جب شہر کا رنگ جلانے لگے، تو سورج سے حرارت کی بجائے پناہ مانگی جاتی ہے، لیکن بارشیں ہوئیں تو کھلا کہ اپنے شہر کا رنگ ہی کچا تھا!

اور رہا شہرِ جاں، تو سُرخ انگور سے چھنی ہُوئی سرد ہَوا نے جس کی گلیوں میں گلابی اُچھال دی تھی، بہار کی پہلی بارشوں نے جسے اس طرح چُوما تھا کہ زندگی سبز روشنی میں نہا گئی تھی، بادِ شمال نے ہجوم کر ہرے موسموں کے تن میں کہیں رگِ تاک کھول دی اور محبت کی اوک سے زندگی کو خوشبو پلا رہی تھی، جہاں وجُود کی بے ہُنر جڑوں تک نمو کی شبنم کچھ اس طرح اُتر گئی تھی کہ بے برگ و بے ثمر شجر پھُولوں کے بوجھ سے جھک جھک گئے۔ جہاں وجُود کے سرمدی دُھندلکے میں آب و آتش کچھ یوں بہم ہُوئے کہ ہَوا نے مٹی کے آگے سر جُھکا دیا اور قدموں کے نیچے تاروں کی طرح بچھی ہُوئی رات، ساقی سے کچھ یوں مل گئی کہ سُپردگی کا نشہ تا عُمر ٹوٹتا نظر نہیں آتا تھا.......

مگر جب زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی، تو سنڈریلا کی جُوتیاں ہی غائب تھیں، نہ وہ خواب تھا، نہ وہ باغ تھا، نہ وہ شہزادہ۔ اچھے رنگوں کی سب پریاں اپنے طلسمی دیس کو اُڑ چکی تھیں اور لہُو لہان ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملتی شہزادی جنگل میں اکیلی رہ گئی ـــــ اور جنگل کی شام کبھی تنہا نہیں آتی! بھیڑیے اس کے خاص دوست ہوتے ہیں! شہزادی کے بچاؤ کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اسے ایک ہزار راتوں تک کہانی کہنی ہے... اور ابھی تو صرف ۲۷ راتیں ہی گزری ہیں!

مادر زاد منافقوں کی بستی میں زیست کرنے کا اور کوئی ہُنر نہیں ـــــ اور ہَوا سے بڑھ کر اور کون منافق ہوگا کہ جو صُبح سویرے پھُول کو چُوم کر جگاتی بھی ہے اور شام ڈھلے اپنے حریص ناخنوں سے اُس پنکھڑیاں بھی نوچ لیتی ہے ـــــ قیمتِ شگفت چکانے میں جاں کا زیاں تو ایسی کوئی بات نہیں، مگر یہ پنکھڑی پنکھڑی ہوکر دربدر پھرنا یقیناً دُکھ دیتا ہے ـــــ ہوا کا کوئی گھر نہیں، سو وہ کسی سر پہ چھت نہیں دیکھ سکتی!

ـــــ محبتیں آندھیوں سے منسُوب نہ سہی، مگر ہَوا کے ہوتے ہُوئے ثمر کا شجر سے ربط رہنا بھی محال ہے ـــــ لیکن شجر کتنا ہی ویران کیوں نہ ہو، اُمیدِ بہار پیوستہ ہے، پھُول کتنا ہی پامال کیوں نہ ہو، اچھے دنوں پر یقین کرنے والے، کوئی نہ کوئی شگون لے ہی لیتے ہیں۔ صد برگ بھی تمام تر ریزہ ریزہ ہوتے کے باوصف، اسی یقین پر مُصرِ اثبات ہے ـــــ اور اس یقین کی کوئی ننھی سی کرن آپ کے دل تک بھی اُتر سکے، تو میں سمجھوں گی کہ میرے وجُود کی ایک پنکھڑی رزقِ ہَوا ہونے سے بچ گئی!

۱۴ جنوری ۱۹۸۰ء

پروین شاکر

جلا دیا شجرِ جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہرا ہو، یہ وہ درخت نہ تھا

وہ خواب دیکھا تھا شہزادیوں نے پچھلے پہر
کہ اُس کے بعد مقدّر میں تاج و تخت نہ تھا

ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

مرے لیے تو وہ خنجر بھی پھول بن کے اُٹھا
زباں سخت تھی، لہجہ کبھی کرخت نہ تھا

اندھیری راتوں کے تنہا مسافروں کے لیے
دیا جلاتا ہُوا کوئی سازِ و رخت نہ تھا

گئے وہ دن کہ مجھی تک تھا میرا دُکھ محدُود
خبر کے جیسا یہ افسانہ لخت لخت نہ تھا

زُود پشیمان

گہری بھُوری آنکھوں والا اِک شہزادہ
دُور دیس سے
چمکیلے مُشکی گھوڑے پر ہَوا سے باتیں کرتا
جگر جگر کرتی تلوار سے جنگل کاٹتا آیا
دروازوں سے لپٹی بیلیں پرے ہٹاتا
جنگل کی بانہوں میں جکڑے محل کے ہاتھ چھُڑاتا
جب اندر آیا تو دیکھا
شہزادی کے جسم کی ساری سوئیاں زنگ آلُودہ تھیں
رستہ دیکھنے والی آنکھیں
سارے شکوے بھلا چکی تھیں !

تسلّی

اب جبکہ میں اپنے آپ پہ
شہرِ وفا کا ہر دروازہ
اپنے ہاتھوں بند کر آئی ۔
اور ان میں ہر اِک کی چابی
سبز آنکھوں والے نسیان کے سرد سمندر میں پھینک آئی ہُوں
ذرا ذرا سا یہ احساس بھی
کتنی ٹھنڈک دیتا ہے
زنداں کی اُونچی دیوار سے دُور

پُرانے شہر کی اِک چھوٹی سی گلی میں
ایک دریچہ
میرے نام پہ کھُلا رہے گا!

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

لوگ تھرّا گئے جس وقت منادی آئی
آج پیغام نیا ظلِّ الٰہی دیں گے

جھونکے کچھ ایسے تھپکتے ہیں گلوں کے رُخسار
جیسے اس بار تو پت جھڑ سے بچا ہی دیں گے

— ق —

ہم وہ شب زاد کہ سُورج کی عنایات میں بھی
اپنے بچّوں کو فقط کور نگاہی دیں گے

آستیں سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہل کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے

شہر کی چابیاں اعدا کے حوالے کر کے
تحفتاً پھر انھیں مقتول سپاہی دیں گے

تمام لوگ اکیلے تھے، راہبر ہی نہ تھا
بچھڑنے والوں میں اِک میرا ہم سفر ہی نہ تھا

برہنہ شاخوں کا جنگل گڑا تھا آنکھوں میں
وہ رات تھی کہ کہیں چاند کا گزر ہی نہ تھا

تمھارے شہر کی ہر چھاؤں مہرباں تھی مگر
جہاں پہ دُھوپ کڑی تھی وہاں شجر ہی نہ تھا

سمیٹ لیتی شکستہ گُلاب کی خوشبُو
ہَوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہُنر ہی نہ تھا

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا

بدن میں پھیل گیا سُرخ بیل کی مانند
وہ زخم سُوکھتا کیا، جس کا چارہ گر ہی نہ تھا

ہَوا کے لائے ہُوئے بیج پھر ہَوا کو گئے
کِھلے تھے پھُول کچھ ایسے کہ جن میں زر ہی نہ تھا

قدم تو ریت پہ ساحل نے بھی نہ رکھنے دیا
بدن کو جکڑے ہُوئے صرف اِک بھنور ہی نہ تھا

کسی کی کھوج میں پھر کھو گیا کون
گلی میں روتے روتے سو گیا کون

بڑی مُدّت سے تنہا تھے مرے دکھ
خُدایا، میرے آنسو رو گیا کون

جلا آئی تھی میں تو آستیں تک
لہُو سے میرا دامن دھو گیا کون

جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

ابھی تک بھائیوں میں دشمنی تھی
یہ ماں کے خُوں کا پیاسا ہو گیا کون

تراش کر مرے بازو اُڑان چھوڑ گیا
ہَوا کے پاس برہنہ کمان چھوڑ گیا

رفاقتوں کا مری اُس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

عجیب شخص تھا بارش کا رنگ دیکھ کے بھی
کُھلے دریچے پہ اک پُھول دان چھوڑ گیا

جو بادلوں سے بھی مُجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دُھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

نکل گیا کہیں اَن دیکھے پانیوں کی طرف
زمیں کے نام کھلا بادبان چھوڑ گیا

عقاب کو تھی غرض فاختہ پکڑنے سے
جو گِر گئی تو یونہی نیم جان چھوڑ گیا

نجانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

عقب میں گہرا سمندر ہے سامنے جنگل
کس انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا

شگون

سات سُہاگنیں اور میری پیشانی!
صندل کی تحریر
بھلا پتھر کے لکھے کو کیا دھوئے گی
بس اتنا ہے
جذبے کی پوری نیکی سے
سب نے اپنے اپنے خدا کا نام مجھے دے ڈالا ہے
اور یہ سُننے میں آیا ہے
شام ڈھلے جنگل کے سفر میں
اِسم بہت کام آتے ہیں!

.... ہوا رہوار تھی میرا

ہوا کی سرسراہٹ سُورۂ اخلاص کی آیت کُشا تھی
نصف شب کی نیم خوابیدہ زمیں
گہرے اندھیروں کا تنفّس
اپنی سانسوں سے اُلجھتے دیکھ کر شرمائی جاتی تھی
لہُو کی گردشوں میں ایک نامعلُوم رقص بے صدا جاری تھا
کوئی جسم کے اندر
بڑی گہری مہارت سے، بہت آہستگی سے، اس ادا سے
پاؤں رکھتا تھا
کہ باہر کا طلسم خامشی پہلے کی صورت دم بخود رہتا

مگر اندر
کھنکتے گھنگھروؤں کے آبشاروں میں سماعت پھول کی پتّی کی صورت
نقرئی دھاروں پہ کِھنچتی جا رہی تھی!
پھر جسم میں تا حدِّ امکاں
چاند کا جادو
ستار سے چُھنتا جاتا تھا
رگوں میں چاندنی یوں بہہ رہی تھی
جیسے ان اُبھرے گلابی اور ہلکے نیلے رستوں پر
بہت پہلے
کسی بے حد پُرانے اور پیارے دوست سے ملتی رہی ہو!
سنہرا رنگ اِک سیلاب بن کر
سبز دیواروں، رو پہلے حاشیوں، ہلکے بنفشی پھول والوں
کاسنی پردوں سے ہو کر
مُشک افشاں زلفِ شب اور سُرخ چادر سے گزر کر

حجلۂ جاں میں اُترتا جا رہا تھا
اُنور پروردہ بصارت روشنی کے نام پر کجلائی جاتی تھی
مگر پھر چاند سے نظریں ہٹانا کتنا مشکل تھا!
گزرتی رات کے ہونٹوں پہ کوئی اسم تھا
جو ذات کے شہر صد آئینہ کے اِک اِک در پہ اپنے ہاتھ رکھتا
جا رہا تھا

اور ہر در کُھلتا جاتا تھا!

مرے آبا کی روحوں سے پرانی
لوک قصّوں، دیومالائی فسانوں سے بھی پہلے کی کہانی
میرے تن سے اپنا منظر لینے آئی تھی
امانت لے کے اپنی
میری شبنم رنگ پیشانی کو جب وہ چُومنے آئی
تو اُس کے لمس کا افسوں عجب تھا!
مرا ننھا سا پیکر

اپنی وسعت میں
اُفق سے تا اُفق
ہفت آسماں تک پھیلا جاتا تھا!

ہوا رہوار تھی میرا
دھنک تھامے ہوئے راسیں
بدن میرا ستارہ تھا!

قدموں میں مرے جھکی ہوئی رات
تاروں کی طرح بجھی ہوئی رات

گرتی ہے بدن پہ قطرہ قطرہ
خوشبو سے کشید کی ہوئی رات

آنکھوں پہ ستارے چن رہی ہے
آنگن میں مرے کھلی ہوئی رات

ماتھے پہ نئی رفاقتوں کے
افشاں کی طرح چنی ہوئی رات

خوابوں کی تجاں ہتھیلیوں پر
مہندی کی طرح رچی ہوئی رات

آہٹ پہ کسی کی کسمسائی
دُلہن کی طرح سجی ہوئی رات

تا عمر نہ ٹوٹنے دے نشہ
ساقی سے مرے ملی ہوئی رات

چھوتی ہوئی ایک ایک تارا
آکاش پہ تیرتی ہوئی رات

حل ہونے لگی لہو میں میرے
سانسوں میں ترے گھلی ہوئی رات

شبنم سے گلاب پوچھتے ہیں
اب تک تھی کہاں چھپی ہوئی رات

اک پل کو جھپک سکی نہ پلکیں
آنکھوں میں رہی رُکی ہُوئی رات

کیا چین کی نیند سو رہی ہے
اِک عمُر سے جاگتی ہُوئی رات

ہے چُور تھکن سے لیکن اب تک
شاداب ہے ٹُوٹتی ہُوئی رات

اک لمحہ سُخن پہ ایسا آیا
چُپ ہو گئی بولتی ہُوئی رات

سُندر، کومل سپنوں کی بارات گزر گئی جاناں
دُھوپ آنکھوں تک آ پہنچی ہے رات گزر گئی جاناں

بھور سمے تک جس نے ہمیں باہم اُلجھائے رکھا
وہ البیلی ریشم ایسی بات گزر گئی جاناں

سدا کی دیکھی رات ہمیں اس بار ملی تو چپکے سے
خالی ہات پہ رکھ کے کیا سوغات گزر گئی جاناں

کس کونپل کی آس میں اب تک ویسے ہی سرسبز ہو تُم
اب تو دُھوپ کا موسم ہے برسات گزر گئی جاناں

لوگ نجانے کن راتوں کی مُرادیں مانگا کرتے ہیں
اپنی رات تو وہ جو تیرے ساتھ گزر گئی جاناں

اب تو فقط صیّاد کی دلداری کا بہانہ ہے ورنہ
ہم کو دام میں لانے والی گھات گزر گئی جاناں

آنکھوں میں تھکن دھنک بدن پر
جیسے شب اوّلیں دلہن پر

دستک ہے ہوائے شب کی تن پر
کھلتا ہے نیا دریچہ فن پر

رنگوں کی جمیل بارشوں میں
اتری ہے بہار پھول بن پر

تھامے ہوئے ہاتھ روشنی کا
رکھ آئی قدم زمیں گگن پر

گزرا تھا کوئی شریر جھونکا
سلوٹ ہے قبائے یاسمن پر

شبنم کے لبوں پہ ناچتی ہے
چھایا ہے عجب نشہ کرن پر

کھلتی نہیں برگ و گل کی آنکھیں
جادو کوئی کر گیا چمن پر

خاموشی کلام کر رہی ہے
جذبات کی مہر ہے سخن پر

وصال

خُمارِ لذّت سے ایک پَل کو
جو آنکھیں چونکیں
تو نیم خوابیدہ سرخوشی میں
غرُورِ تاراجگی نے سوچا
خُدائے بَرتر کے قہر سے
آدم اور حوّا
بہشت سے جب بھی نکلے ہوں گے
سپُردگی کی اسی حسیں انتہا پہ ہوں گے
اسی طرح
ہم بدن اور ہم خواب و ہم تمنا!

سپردگی

زمیں اپنے قدیم محور کے گرد رقصاں ہے
اور فضا میں
کسی پُراسرار سرخوشی کا سُرور اس طرح بہہ رہا ہے
کہ جیسے بادِ شمال نے جھوم کر ہرے موسموں کے تن میں
کہیں رگِ تاک کھول دی ہو
اور اب محبت کی اوک سے زندگی کو خوشبو پلا رہی ہے!
نظر سے اوجھل کوئی خوشی ہے
کہ جسم کی پور پور کو چھو رہی ہے آکر
نموُ کی نیلی صداقتوں میں اُترنے والی گلابی لذت
مرا بدن چومنے لگی ہے

یک زماں کو نئی زندگی دے کے
جسم سے جان کھینچتا ہے
یہ جیاں سے جانے کا اور مسیحائی کا تصادم
عناصرِ زندگی کا بے حد قدیم سنگم
وجود کے سرمدی دھندلکے ہیں
آب و آتش بہم ہوئے ہیں
ہوا نے مٹّی کے سامنے سر جھکا دیا ہے!

دُودھ، شہد اور شبنم

وہی بدن ہے
کہ ابرِ نیساں سے قبل
بے برگ و بے ثمر تھا
بہار کی بارشوں میں ایسا نکھر گیا ہے
کہ زندگی سبز روشنی میں نہا گئی ہے
وجُود کی بے ہُنر جڑوں تک
نمو کی شبنم اُتر چکی ہے
جلی ہُوئی شاخ کی نئی کونپلوں میں پھر دُودھ بھر رہا ہے
ہزاروں خوش رنگ تتلیوں کا حسین جُھرمٹ
شجر کے تن پر جُھکا ہُوا ہے
محبتیں اعتبار پا کر
بدن کے سب ذائقوں کو امرت بنا رہی ہیں!

بچ رہا تھا اک پرندہ ڈال پر ہنستا ہُوا
جال وہ پھینکے ہوا نے وہ بھی پر بستہ ہُوا

دے کے مجھ کو اذن گہرے پانیوں کی سیر کا
خود روانہ ہے وہ میری رسیاں کستا ہُوا

شہر کی ہر رہگزر پر برف خیمہ زن ہُوئی
بند اگلے چاند تک اب دھوپ کا رستہ ہُوا

جو ہوا آئی مرے چہرے پہ پاؤں رکھ گئی
اُونچی شاخوں کا شگوفہ برگِ نو رستہ ہُوا

ریت پر لکھا گیا یا سطحِ موجِ آب پر
نام جو اُس آنکھ کی وحشت سے وابستہ ہُوا

بختِ رُسوائی کہ کوئی اپنی نظروں میں گِرا
اور کوئی مصر کے بازار میں سستا ہُوا

چاند کا پیغام دھندلا تھا نہ چہرہ حرف کا
شہر کے سارے دریچوں پر ہے پردہ برف کا

یہ ہوا کی سرد مہری تھی کہ میرے دل کا خوف
جم گیا ہے ہونٹ پر آ کر تنفس حرف کا

دیکھ کر قاتل کے پیچھے در گزر کرتا قصاص
کون تھا مقتول کے یاروں میں اتنے ظرف کا

ایک وہ موسم کہ مجھ پر مسکراہٹ جبر تھی
اور اب موقع نہیں ملتا ہنسی کے صرف کا

ہاتھ بھی جھلسے، بدن بھی بے اماں ہو کر رہا
چھوڑ کر کشتی بنایا جب گھروندہ برف کا

ہنی مُون

سُرخ انگور سے چھنی ہُوئی یہ سرد ہَوا
جس کو قطرہ قطرہ پی کر
میرے تن کی پیاسی شاخ کے سارے پیلے پھُول گلابی
ہونے لگے ہیں

سوچ کے پتھّر پہ ایسی ہریالی اُگ آئی ہے
جیسے ان کا اور بارش کا بڑا پُرانا ساتھ رہا ہو
ہریالی کے سبز نشے میں ڈُوبی خوشبُو
میری آنکھیں چُوم رہی ہے

خوشبو کے بوسوں سے بوجھل میری پلکیں
ایسے بند ہوئی جاتی ہیں
جیسے ساری دُنیا اِک گہرا نیلا سناٹا ہے
جو پاتال سے مجھ کو اپنی جانب کھینچ رہا ہے
اور میں تن کے پورے سُکھ سے
اس پاتال کی پہنائی میں
دھیرے دھیرے ڈُوب رہی ہُوں!

کلام

(۱)

ہوا میں زمرّد گھلا ہے!
(شجر کا بدن ایک لمس گریزاں میں شاداب کر دے)
کوئی لاتعلق سا جھونکا
کسی سنگ ریزے کے رخسار کو تھپتھپا دے
تو وہ دیکھتے دیکھتے
سبز خط ہو کے یوں جی اٹھے گا
کہ بنجر پہاڑوں کے چہرے گلابوں کے سہرے میں چھپ جائیں گے
کاسنی پتھروں سے پرے

نیلے چشموں کی آواز سے بال دھوتی ہوئی شوخ چنچل ہوا
زندگی کی سہاگن ہنسی
پیڑ، آنگن، دریچے
جیسے چُوم لے
رنگ سے بیاہ دے!

کالام

(۲)

برف کی رُت اور تن پر ایک بوسیدہ قبا
جس سے جگہ جگہ موسم کی نیلی شدت جھانک رہی ہے
پر جھونکے پر ہلتے ہُوئے لکڑی کے مکاں
جن پر بارش پنجے گاڑے بیٹھی ہے
سرد ہوا سے سارے گھر زخمی ہیں
لیکن — سب کی چھتوں پر
نیلے پیلے سبز گلابی جھنڈے ایسے اڑتے ہیں
جیسے وادی کے سب بچّے ریشم پہنے گھوم رہے ہوں !

نیلم - تیرے کتنے رنگ

پتھر کاٹ کے اپنا رستہ ڈھونڈنے والے نیلم!
تیری نرم آواز کے سائے سائے پہنچے جنتی
تیرے کناروں پر سے تیری سبز کمانی پہنچی
شہر سے آئی لڑکی،
تجھ کو بہتے، تجھ کو ہنستے، تجھ کو موج اڑاتے دیکھے
من ہی من میں سوچے
پو پھٹنے سے لے کر چاند کے ڈھل جانے تک
تیرے سارے رنگ عجب ہیں

کبھی تو بچے کی آنکھوں میں جمی ہوئی حیرت کی صورت نیلا
کبھی کسی کی پہلی چاہت جیسا اُجلا
کبھی شہر کو جانے والے رستے کی صورت کالا۔
کبھی ہرن کی آنکھوں جیسا من موہن بھولا بھالا۔

بادل کے مٹیالے دُکھ کا سارا بھُورا پن اپنائے
چاند کے سینے کے ہر داغ کو اپنے اُجلے من میں چھپائے
سبز کبھی اُمید کی صورت
زرد فراق کے جیسا
چرواہن کی اوڑھنی جیسی کبھی کاسنی لہریں
سُرخ پہاڑ تک آتے آتے وہی جامنی لہریں
پھولوں کے جھرمٹ تک پہنچے جونہی سادہ پانی
کہیں سنہرا کہیں چمپئی کہیں چمکتا دھانی
کھلے روپہلے آسمان تک آکر پھر وہی نیلا
وہی ازل اور ابد کا رنگ جو کبھی پڑا نہیں پھیکا
لہر کے ساتھ سفر کرتے مری آنکھیں دیکھنے آئیں
تیرے رنگ نہ ٹھہرے۔

تیری موجیں نہ رُکنے پائیں
نیلم — تُو بھی عجب مسافر
صدیوں سے اوروں کے لیے بہتا جائے
سب کے دُکھ سُکھ آئینہ کرتا جائے!

شرارت

جھاگ اُڑاتا چشمہ
میرے بال بھگو کر
دُور کہیں جا نکلا ہے
لیکن اُس کی شوخی اب تک
میری مانگ سے موتی بن کر
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے!

گیلے بالوں سے چھنتا سُورج

شوخ کرن نے
گیلے ریشم بالوں کو جس لمحہ چھُوا
بے ساختہ ہنس دی
پلکوں تک آتے آتے
سُورج کی ہنسی بھی
گوری کی مُسکان کی صُورت
سات رنگ میں بھیگ چکی تھی!

بج اُٹھے ہوا کے دَف وجد میں کلی آئی
زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی

میں بھی کتنی جنوں تھی ایک لُطفِ مبہم پر
رقص گہ میں گرگابی چھوڑ کر چلی آئی

چشم و دل کے سب آنسو اس ہوا میں کھل اُٹھے
شاخسارِ مژگاں پر رُت گلاب کی آئی

شہر کے شگوفوں کے نیم رس سے اُکتا کر
تازگی سے ملنے کو بن میں تیتری آئی

اس سے قبل بھی سائے کب قریب آئے تھے
اس نئے سفر میں بھی کام دُھوپ ہی آئی

تُو نے کبھی سوچا

گلہ کم گوئی کا مجھ سے بجا ہے
لیکن اے جانِ سخن!
تُو نے کبھی سوچا
کہ تیری سمت جب میں آنکھ بھر کر دیکھتی ہُوں تو
مری ہلکی سُنہری جلد کے نیچے
اچانک
اتنے ڈھیروں ننھے ننھے سے دیے کیوں جلنے لگتے ہیں؟

اولمپکس

مُقدّس رسم ہے
سو آج بھی اہلِ یُوناں
فصلِ گُل میں
سُرخ سُورج کی کرن سے اپنی مشعل کو جلا کر
کھیل کے تہوار کا آغاز کرتے ہیں
یہ منظر ساری دُنیا دیکھتی ہے
مگر یہ بات کس کے علم ہو گی
کہ اب کے سال
پہلے ایشیا کے ایک بہت چھوٹے سے قصبے کے
بہت ننھّے سے آنگن میں

جو دو شمعیں جلی ہیں
ان کی لَو کو چاند نے روشن کیا ہے
اور یہ منظر صرف دو آنکھوں نے دیکھا ہے .
مگر یہ کھیل
(شاید زندگی کا سب سے پیارا کھیل)
ان مقدونیوں کے کھیل سے بے حد پرانا ہے !

بُلاوا

مَیں نے ساری عُمر
کسی مندر میں قدم نہیں رکھّا
لیکن جب سے
تیری دُعا میں
میرا نام شریک ہُوا ہے
ترے ہونٹوں کی جنبش پر
میرے اندر کی داسی کے اُجلے تن میں
گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں!

محبّت آشنا

مَیں تجھ سے مل کے جونہی باہر آئی
مارچ کی تیکھی ہَوا
بچپن کے ساتھی کی طرح سے
رنگ کی پچکاریاں تھامے کھڑی تھی
قبل اس کے
مَیں ہَوا کی مُسکراہٹ کو سمجھ پاتی

مری پیاری سہیلی
رنگ میں مجھ کو بھگوتی، کھلکھلاتی، ناچتی

پل بھر میں اوجھل ہو چکی تھی

اور پل بھر میں ہی
میرے جاگتے تن پر
دھنک کی اتنی قوسیں بن چکی تھیں
آج جتنی بار مجھ کو دیکھ کر تو مسکرایا تھا!

اِسم

بہت پیارے
بعد مدت کے
جب سے کسی شخص نے چاند کہہ کر بلایا ہے
تب سے
اندھیروں کی خوگر نگاہوں کو
ہر روشنی اچھی لگنے لگی ہے!

جمالِ ہم نشیں

ترے آئینۂ فن میں
سراپا دیکھ کر اپنا
بہت حیران ہُوں
اور بار ہا پلکیں جھپکتی ہُوں کہ یہ میں ہُوں
(کہ کوئی اور لڑکی ہے!)
مری آنکھوں میں پہلے بھی شرارت تھی
مگر اب تو ستارے کِھلکھلاتے ہیں!
مرے لب اِس سے پہلے بھی تبسّم آشنا تھے

لیکن اب تو بے ضرورت مُسکراتے ہیں
غرُور ایسا کہاں کا آگیا دھیمے مزاجوں میں
کہ دن میں بھی اُڑی پھرتی ہُوں خوابوں کی ہَواؤں میں
مرے لہجے میں ایسی نرم فامی کب سے در آئی
کہ جس سے بات کرتی ہُوں
سماعت پھُول چُنتی ہے
ہنسی میں اس کھنک کی گُونج ہے
جس سے محبّت گیت بُنتی ہے
اور ان سب سے سوا
دل کی گدازی۔
جو مجھ کم ظرف کو شائستۂ ضبطِ الم کر دے
کہ دُشمن کی بھی اُنگلی تو میری آنکھ نم کر دے
سکھائے چشم پوشی
دوست کا پردہ رکھے

بلکہ

خلوصِ ہم رہاں کو شک کی آنکھوں سے ہمیشہ دیکھنا ہی
ترک کروا دے

ہُو کے اعترافِ عشق پر ایمان لانے کی بصیرت دے
مجھے گوتم کے ہر اُپدیش، عیسٰی کے ہر اک سرمن کا بین السّطر
سمجھا دے!

میں اُس کی خوش گُماں آنکھوں سے
دُنیا دیکھتی ہُوں
مُسکرا کر سوچتی ہُوں،
زمیں یک لخت کتنی خوبصورت ہو گئی ہے!

شہر کو تیری جستجو ہے بہت
ان دنوں ہم پہ گفتگو ہے بہت

جب سے پرواز کے شریک ملے
گھر بنانے کی آرزو ہے بہت

درد رہ رہ کے سر اٹھاتا ہے
کبھو کم ہو گیا، کبھو ہے بہت

کچھ تو وہ یاد بھی بہت آیا
کچھ ان آنکھوں میں بھی لہو ہے بہت

پینے والی نگاہ ہے درکار
آنکھ کو چاند کا سبو ہے بہت

دھوپ سات رنگوں میں پھیلتی ہے آنکھوں پر
برف جب پگھلتی ہے اس کی نرم پلکوں پر

پھر بہار کے ساتھی آ گئے ٹھکانوں پر
سُرخ سُرخ گھر نکلے سبز سبز شاخوں پر

جسم و جاں سے اُترے گی گرد پچھلے موسم کی
دھو رہی ہیں سب چڑیاں اپنے پنکھ چشموں پر

ساری رات سوتے میں مُسکرا رہا تھا وہ
جیسے کوئی سپنا سا کانپتا تھا ہونٹوں پر

تتلیاں پکڑنے میں دُور تک نکل جانا
کتنا اچھا لگتا ہے پھُول جیسے بچّوں پر

لہر لہر کرنوں کو چھیڑ کر گزرتی ہے
چاندنی اُترتی ہے جب شریر جھرنوں پر

بس اے بہار کے سورج! بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تری دھوپ میرے شہر کا رنگ

شجر کو سبز قبا دیکھ کر یہ الجھن ہے
کہاں پہ رنگِ نمو ہے کہاں پہ زہر کا رنگ

کنارِ جوئے رواں جب سے قتل گاہ بنی!
ہجوم امڈنے لگا دیکھنے کو نہر کا رنگ

ابھی تو میں نے سمندر میں ناؤ ڈالی تھی
یہ کیا ہوا کہ بدلنے لگا ہے لہر کا رنگ

یہ احتجاج بجا ہے کہ تیز تھی بارش
یہ ماننا ہے کہ کچا تھا اپنے شہر کا رنگ

گلہ ہی کیا ہے اگر وہ بھی سبز چشم ہُوا
طبیعتوں پہ تو چڑھتا رہا ہے دہر کا رنگ

وہ آج بھی مجھے سوتے میں ڈسنے آئے گا
وہ جانتا ہے کہ کھِلتا ہے مجھ پہ زہر کا رنگ

اُترنے پائے گا قوسِ قزح کا تھام کے ہاتھ
سوادِ حرف میں کب عشقِ بے سپہر کا رنگ

امیرِ شہر سے سائل بڑا ہے
بہت نادار لیکن دل بڑا ہے

لہُو جمنے سے پہلے خوُں بہا دے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

چٹانوں میں گھرا ہے اور چُپ ہے
سمندر سے کہیں ساحل بڑا ہے

کسی بستی میں ہو گی سچ کی حُرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

جو خلقِ اللہ پر ایمان لائے
وہی داناؤں میں عاقل بڑا ہے

اُسے کھو کر بہائے درد پائی
زیاں چھوٹا تھا اور حاصل بڑا ہے

پرو دیے مرے آنسو ہوا نے شاخوں میں
بھرم بہار کا باقی رہے نگاہوں میں

صبا تو کیا کہ مجھے دھوپ تک جگا نہ سکی
کہاں کی نیند اُتر آئی ہے اِن آنکھوں میں

کچھ اتنی تیز ہے سرخی کہ دل دھڑکتا ہے
کچھ اور رنگ پسِ رنگ ہے گلابوں میں

سپردگی کا نشہ ٹوٹنے نہیں پاتا
انا سمائی ہوئی ہے وفا کی باہوں میں

بدن پہ گرتی چلی جا رہی ہے خواب سی برف
خنک سپیدی گھلی جا رہی ہے سانسوں میں

سیف الملوکؔ[1] سے!

شہزادے!
تُو خوش قسمت تھا — !
جس خواب کی اُنگلی تھامے —
تُو رستم وکے کی مٹی سے
سرکش دریاؤں تنگ نیکلی گھاٹیوں، سخت چٹانوں سے
ہوتا ہُوا
ساٹھ برس میں —
مغرُور ہمالہ کی اس پتھر چوٹی تک آپہنچا تھا
اس خواب نے خود برسوں تیرا رستہ دیکھا

---

[1] وادیٔ کاغان کی ایک لوک روایت کا کردار

اور تیری سبز پری نے ـــــ
پھر تیری پذیرائی اس شان سے کی
کہ اپنی مٹی، اپنا پانی ـــــ
اور اپنی ہوا اور اپنی آگ ـــــ
سب تیرے حوالے کر دی ـــــ
ترے پاؤں کے سب چھالے شبنم انجام ہوئے
ترا ایک جنم ـــــ اور ایک سفر
منزل سے آ کر گلے ملے
مرے سارے جنم اور سارے سفر
منزل سے پہلے اُجڑ گئے
مرے پاؤں ہمیشہ اُکھڑ گئے!

نِک نیم[1]

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو ——!
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہُوں
جو پہنا دو، مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچّے کے ہاتھ تھما دو
میری کسی سے جنگ نہیں

---

[1] NICK NAME

سوچتی جاگتی آنکھیں میری
جب چاہے بینائی لے لو
کوک بھرو اور باتیں سُن لو
یا میری گویائی لے لو
مانگ بھرو، سیندور لگاؤ
پیار کرو، آنکھوں میں بساؤ
اور پھر جب دل بھر جائے تو
دل سے اُٹھا کے طاق پہ رکھ دو
تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو!

کس شہر میں لائی خوش کلامی
دل پیشہ بنی و رفیق شامی

اک عمر سے زندگی کا معمول
تنہائی ہے اور خود کلامی

دریا بھی ہو میری رہگذر ہو
تقدیرِ سفر ہے تشنہ کامی

کچھ رستے ہیں عشق کے، جہاں پر
آتی نہیں کام تیز گامی

سب فیض اُسی شفق نظر کا
کیا چیز ہے میری لالہ فامی

جو اپنے ہُماں کی جزا لے
کس کام کی ایسی نیک نامی

سب عشق کریں گے اور سچّا
ہے اپنے قبیلے میں یہ جنامی

جس جال کی رسّیاں ہوں ڈھیلی
کیا سمجھے گا میری زیرِ دامی

ننّھا سا پرند شاخِ گُل پر
ہے ابرِ بہار کا پیامی

رنگوں کو تو چُن دیا نظر میں
خوشبُو کی زمام کس نے تھامی

جذبات ہی کُند ہیں تو بے کار
تلوار کی لاکھ بے نیامی!

آنکھوں سے رواں ہے جوئے خوں پر
پہلی سی نہیں سُبک خرامی

یہ رسم تو مدتے سے چلی ہے
دل والوں کو درد کی سلامی

ہم بے ہُنروں کی زیست پل بھر
اقبال کی زندگی دوامی!

کیکر تے انگور چڑھایا

وہ وقت جو تجھ بِن بیت گیا
اس وقت کا کون حساب کرے،
اک دُھوپ چھاؤں کا موسم تھا،
کبھی زخمِ جگر، کبھی مرہم تھا
یُوں جان کہ وہ گزری ہُوئی عمر
اک لمبی کالی رات تھی
جس کے ماتھے پر
جھوٹے تاروں کی افشاں تھی

(اور اس افشاں کو میں نے اپنی مانگ میں بھرنا چاہا تھا!)
اک لمبی کالی رات کہ جس کے پہلے پہر کی آنکھوں میں
اَدھ کھلے دریچے اور ان کی بے خوابی تھی،
اور پچھلے پہر کی سانسوں میں
پھر کبھی نہ آنے والوں کے قدموں کی آہٹ
واہمہ بن کر گونجتی تھی۔
(ہر واہمہ تب کس درجہ یقین سا لگتا تھا)
میں ایسی شاخ کہ جو اپنی کچّی کلیاں
بارش سے قبل جلا بیٹھی
جب پھول آنے کے دن آئے
بادل کا پیار گنوا بیٹھی۔
کیسی کیسی بے معنی باتوں میں شامیں برباد ہوئیں
کیسے بے مصرف کاموں میں اُجلی راتیں برباد ہوئیں
کس درجہ منافق لوگوں میں دل سچّی بات سُناتا رہا

وہ جن کے قلوب پہ مہریں تھیں انھیں روشنیاں دکھلاتا رہا
کیسے کیسے پیارے جذبے
کن ناقدروں کو دان کیے
کیسی بارآور رُت نے بے زر موسم سے پیمان کیے
کن کم ہمت شہزادوں کے وعدوں پہ بھروسا کرکے
اپنے نوخفتہ جسم میں سُوئیاں گڑوائیں
کن آسیبوں کے کہنے میں
آبادیاں شہرِ جاں کی تمام اُجڑوائیں

کیا کیا دُکھ دل نے پائے
ننھی سی خوشی کے بدلے
ہاں کون سے زخم نہ کھائے
تھوڑی سی ہنسی کے بدلے

زخموں کا کون شمار کرے
یادوں کا کیسے حصار کرے
اور جینا پھر سے عذاب کرے
اُس وقت کا کون حساب کرے
وہ وقت — جو تجھ بن بیت گیا!

شام آئی، تری یادوں کے ستارے نکلے
رنگ ہی غم کے نہیں، نقش بھی پیارے نکلے

ایک موہوم تمنا کے سہارے نکلے
چاند کے ساتھ ترے ہجر کے مارے نکلے

کوئی موسم ہو مگر شانِ خم و پیچ وہی
رات کی طرح کوئی زُلف سنوارے نکلے

رقص جن کا ہمیں ساحل سے بہا لایا تھا
وہ بھنور آنکھ تک آئے تو کنارے نکلے

وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سُبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جُرم ہمارے نکلے

عشق دریا ہے، جو تیرے وہ تہی دست رہے
وہ جو ڈُوبے تھے، کسی اور کنارے نکلے

دُھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اُگاتا کیسے
شاخ پھُوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آرے نکلے

ایک سفر

اُونچے نیچے پُراسرار پہاڑی رستے
رستوں کے نیچے بل کھاتا دریا
دریا اور پہاڑ سے ہٹتا بچتا
طُوفانی بارش میں
ہَوا سے باتیں کرتا
میرا مُشکی گھوڑا
اور تری چاہت کی راس!

ایک کوہستانی المیہ

بادل اتنے پاس ——
ہاتھ بڑھا کر چھو لیں!
پانی اتنی دور ——
ہاتھ کٹا کر بھی کچھ ہاتھ نہ آئے!

اسلام آباد ــــ علی الصبح

ہلکی سُرخ پہاڑی پر
دُودھیا پھُولوں کی چادر
کچھ ایسے بچھی تھی
جیسے پہلی رات کے بعد
دُلہن کے آنچل سے جھڑنے والے تارے
صُبح کی سیج پہ کھلے ہُوئے ہوں!

جیون ساتھی سے!

دھوپ میں بارش ہوتے دیکھ کے
حیرت کرنے والے!
شاید تُو نے میری ہنسی کو
چُھو کر
کبھی نہیں دیکھا!

نئی آنکھ کا پُرانا خواب

آتش دان کے پاس
گلابی حِدّت کے ہالے میں سمٹ کر
تجھ سے باتیں کرتے ہوئے
کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے
جیسے اوس میں بھیگی گھاس پہ
اس کے بازو تھامے ہُوئے
مَیں پھر نیند میں چلنے لگی ہُوں !

محرومی

ننھّے سواتی بچّے کے کشکول میں
صبُح سے شام تلک
نیلی آنکھوں، بھُورے بالوں، دھن دانوں کی بدولت
اُجلی ہنسی اور چمکیلے آنسو کے عکس کے بدلے
میلے سکّے آج بھی دن بھر گرتے رہے
آج بھی کھوجتی رہی سماعت
کاسۂ دل میں کوئی کھنک!

گونج

اونچے پہاڑوں میں گم ہوتی پگڈنڈی پر
کھڑا ہوا تھا چرواہا
بکری کے بچے کو پھسلتے دیکھ کے
کچھ اس طرح ہنسا ہے
وادی کی ہر درز سے جھرنے پھوٹ رہے ہیں!

خاکم بدہن

سرکار!
ہم تو آپ کے ایماں نثار تھے
ہر مقتلِ جفا میں لہو کے شریک تھے
کم پوشئ قبا میں رفو کے شریک تھے
دل آپ کا دُکھا ہے تو آنسو اِدھر بہے
چوٹ آپ کو لگی تھی مگر نیل کب پڑے
اپنی ہی سمت کھینچا ہُوا تیر ہم بھی تھے
اپنے خلاف لی ہُوئی تعزیر ہم بھی تھے

لیکن یہ دُکھ بہت تھا کہ کچھ معتبر تو ہیں
منزل نہیں ہیں آپ کی گردِ سفر تو ہیں
یہ کیا کہ گردِ سفر بھی نہ اُٹھ سکے
چشمِ خطا سے بارِ نظر بھی نہ اُٹھ سکے
اب تک تو شہرِ جاں پہ عذاب آئے تھے مگر
اب کے تو اعتبار کی دُنیا اُجڑ گئی
ماتھے پہ بل نہ آنے دیا تھا کبھی تو پھر
لہجے میں اتنی گہری شکن کیسے پڑ گئی؟

بدن کے موسم بے اختیاری میں

کوئی دن زندگی میں ایسا آئے
تو میرے دھیان کھو کر
رموزِ شہر یاری بھول جائے
میں اس شدت سے یاد آؤں
شکوہِ کج کلاہی بھول جائے
تجھے بھی سارے رشتے، سارے ناتے
خود فراموشی بہائے جائے
کُل دُنیا سمٹ کر تیری بانہوں میں سما جائے

بدن کے موسمِ بے اختیاری میں
کسی پل —
فصیلِ شہر سے باہر
حصارِ چادر و دستار کی حد سے نکل کر
ایک لمحے کو — بس اک لمحے کو
ہم اپنے مقدر آزمالیں —
شبِ ممنوع سے اِک پَل چُرا لیں!

تاوان

گُل انار کی ہلکی گلابی چھاؤں میں بیٹھ کے
کافی بنانا
مجھے بھی اچھا لگتا ہے
لیکن ایسا کرتے ہوئے
میری جھکی ہوئی پلکیں
تجھ سے جو رنگ چھپاتی ہیں
وہ اس چھاؤں کے رنگ سے بڑھ کر گہرا ہے!

ہَوا چلے تو

ہَوا چلے تو
اپنی سمت بُلاتی ہے
پیڑ کے نرم گھنے پتّوں میں
اٹکی ہُوئی بارش کی ہنسی!

ساتھی

اکیلے گھر میں
شریر چڑیا کا گیت
چہرے اُگا رہا ہے!

نیرنگ

جابر حاکم کے دل جیسا
تنگ سیاہ پہاڑ
مظلوموں کی آنکھوں جیسا
ہر پتھر کا سینہ
ہوا چلی اور جاگ اٹھا
کوئی زخم پرانا
ٹیس لگی اور پھوٹ بہا
گرم لہو پہلا چشمہ

چیڑ کے مغرور پیڑ

چیڑ کے مغرور پیڑ
جن کی آنکھیں
اپنی قامت کے نشے میں صرف اُوپر دیکھتی ہیں
اپنی گردن کے تناؤ کو کبھی تو کم کریں
اور نیچے دیکھیں
وہ گھنے بادل جو اُن کے پاؤں کو چُھو کر گزر جاتے ہیں
جن کو چُوم سکتے ہیں
وہ پودے
پیار کے اس والہانہ لمس سے کیسے نکھر آئے !

پیشی

شہر میں نیکیوں کی سزا ہیں
مری ذات بھی ایک دن
واژگوں جام کی طرح
میخانۂ زندگی میں
تجسّس سے پیاسی نگاہوں کے آگے بکھر جائے گی
جس کا دل چاہے
جس ہاتھ سے
جس طرح سے چھوئے
قطرے قطرے کو دینا پڑے گا
نشے کا حساب!

سجدہ

جسم کی چاہ میں
آتشِ لمس سے جب رگِ جاں چٹخنے لگے
اور من و تُو کے مابین
اک بال سے بڑھ کے باریک لمحہ بھی آخر بکھرنے لگے
اُس سمے
صرف میری نگاہوں کا دُکھ دیکھ کر
ہر طلب کی زباں کاٹ دینا
تمہاری بڑائی ہے
اور اس بڑائی کے آگے
مِرے لب ابھی تک تمہارے نقوشِ قدم پر جھکے ہیں!

پا بہ گِل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جُرم کو تحریر کون

آج دروازوں پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے مری تعزیر کون

کوئی مقتل کو گیا تھا مدّتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اب تک صُورتِ تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری، پھر دے گیا تشہیر کون

سچ جہاں پابستۂ ملزم کے کٹہرے میں ملے
اُس عدالت میں سُنے گا عدل کی تفسیر کون

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھروندا کر گیا تعمیر کون

سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آ گئی ہوتی ہُوئی سر سے

برسا بھی تو کس دشت کے بے فیض بدن پر
اک عُمر مرے کھیت تھے جس ابر کو ترسے

اس بار جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اُس بوڑھے شجر سے

محنت مری آندھی سے تو منسوب نہیں تھی
رہنا تھا کوئی ربط شجر کا بھی ثمر سے

خود اپنے سے ملنے کا تو یارانہ تھا مجھ میں
میں بھیڑ میں گم ہو گئی تنہائی کے ڈر سے

بے نام مسافت ہی مقدر ہے تو کیا غم
منزل کا تعیّن کبھی ہوتا ہے سفر سے

پتھرایا ہے دل یوں کہ کوئی اسم پڑھا جائے
یہ شہر نکلتا نہیں جادو کے اثر سے

نکلے ہیں تو رستے میں کہیں شام بھی ہو گی
سورج بھی مگر آئے گا اس رہگزر سے

اسٹینوگرافر

چمکیلی صبح سے پہلے
جب نیند بدن میں شہد کی صورت گھلتی ہو
اور صبا کے ہاتھوں گرہ ہر درد کی کھلتی ہو
اُس وقت شفا
سب کچے زخم بدن کے
سب پیاسے سپنے تن کے
بے قیمت جان کے اُٹھنا
اک بارسی مان کے اُٹھنا

اور خود کو موسم کی بے مہر ہَوا کے حوالے کر دینا
دن بھر بے معنی ہندسوں
اور بے مقصد ناموں کو
بس خالی ذہن اور بے حس ہاتھ سے ٹائپ کرتے جانا
گاہے گاہے حسبِ موقع
گنجے سر والے باس کی میٹھی اور کڑوی باتیں سہنا
اور پتّھر کی مُورت کی طرح ہر لہجے پر چُپ رہنا
پھر شام گئے
جب چڑیاں تک اپنے گھر کی ہو جائیں
دفتر کی خُنک بھٹّی سے
جُھلسا ہُوا چہرہ لے کر
صدیوں کی تھکن سے دوہرے
جھکتے ہُوئے شانے تھامے
بھُو کی آنکھوں، جلتے فقروں، گھر تک چھوڑ آنے والی
شائستہ کاروں سے بچتی

ڈر ڈر کے قدم اُٹھاتی
اک اسٹینو گرافر
اپنے گھر لوٹ آتی ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار کو تھام کے شاید روز ہی کہتی ہے
مالک !
اک دن ایسا بھی آئے
میرے سر پر چھت پڑ جائے !

ورکنگ وومن

سب کہتے ہیں
کیسے غرور کی بات ہُوئی ہے
مَیں اپنی ہریالی کو خود اپنے لہُو سے سینچ رہی ہُوں
میرے سارے پتّوں کی شادابی
میری اپنی نیک کمائی ہے
میرے ایک شگوفے پر بھی
کسی ہوا اور کسی بارش کا بال برابر قرض نہیں ہے
مَیں جب چاہوں کِھل سکتی ہوں

میرا سارا رُوپ مِری اپنی دریافت ہے
مَیں اب ہر موسم سے سر اُونچا کر کے مل سکتی ہُوں
ایک تناور پیڑ ہُوں اب مَیں
اور اپنی زرخیز نمو کے سارے امکانات کو بھی پہچان رہی ہُوں
لیکن میرے اندر کی یہ بہت پُرانی بیل
کبھی کبھی — جب تیز ہَوا ہو
کسی بہت مضبُوط شجر کے تن سے لپٹنا چاہتی ہے!

اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اُس کی طرح یاد کرے

دل عجب شہر کہ جس پر بھی کھُلا در اِس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

اتنا حیراں ہو مری بے طلبی کے آگے
وا قفس میں کوئی در خود مرا صیاد کرے

سلبِ بینائی کے احکام ملے ہیں جو کبھی
روشنی چھُونے کی خواہش کوئی شب زاد کرے

سوچ رکھنا بھی جرائم میں ہے شامل اب تو
وہی معصوم ہے ہر بات پہ جو صاد کرے

جب لہُو بول پڑے اس کے گواہوں کے خلاف
قاضئ شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

اس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

ملالِ تیز روی

کتنا عجب ہے یہ راگ ملن کا
کوئی بھی سُر تو نہیں کومل
ایسی شور مچاتی ہَوا میں
کیسے کِھلے تن کی کونپل
اور ہِردے کی وہ آنکھ
جو موہ کی رُت میں شریر سے پہلے جاگا کرتی ہے
وقت کے اتنے تیز بہاؤ میں
تجھ سے ملن کی رُت کچھ ایسے گزرتی ہے

جیسے گھنے جنگل میں سرپٹ دوڑتی ریل کی کھڑکی سے
ہاتھ بڑھا کر
کسی گھنیری شاخ کو تھامنا چاہوں
اور اپنے پھیلے ہُوئے ہاتھ پہ
ایک خراش بسا لوں
اک انکار کی نیلی لکیر کا
اور اضافہ کر لوں !

پذیرائی

ابھی مَیں نے دہلیز پر پاؤں رکھا ہی تھا ۔۔۔ کہ
کسی نے مرے سر پہ پھولوں بھرا تھال اُلٹا دیا ۔۔۔
میرے بالوں پہ، آنکھوں پہ، پلکوں پہ، ہونٹوں پہ،
ماتھے پہ، رُخسار پر
پھول ہی پھول تھے
دو بہت مسکراتے ہُوئے ہونٹ
میرے بدن پر محبّت کی گُلنار مہروں کو یوں ثبت کرتے
چلے جا رہے تھے

کہ جیسے ابد تک
مری ایک اک پور کا انتساب
اپنی زیبائی کے نام سے کر رہیں گے
مجھے اپنے اندر سمو کر رہیں گے!

نیگ

صُبحِ وصال کی پو پھٹتی ہے
چاروں اُور،
مدھ ماتی بھور کی نیلی ٹھنڈک پھیل رہی ہے
شگُن کا پہلا پرند
مُنڈیر پر آ کر
ابھی ابھی بیٹھا ہے
سبز کواڑوں کے پیچھے اک سُرخ کلی مُسکائی
پازیبوں کی گُونج فضا میں لہرائی
کچے رنگوں کی ساری میں
گیلے بال چھپائے گوری
گھر کا سارا باجرہ آنگن میں لے آئی!

بے پناہی

کسی اور کے بازوؤں میں سمٹ کر
تجھے سوچنا
کس قدر منفـــرد تجربہ تھا!
یہ احساس ہی کس قدر جان لیوا ہے جاناں!
کہ ایسی جگہ۔ اس خنک زار میں
میرے تن پر پھسلتی ہُوئی شبنمی حِدتیں
تیری لذّت فشاں اُنگلیوں سے اگر پھُوٹتیں
تو مرے جسم کی ایک اک پور تب کس طرح جگمگاتی
ترے روشنی آشنا ہاتھ
کیسے بھٹکتے

یہاں
اب یہاں
اور اب سرخوشی کی اُس اک آخری یاد رہ جانے والی گھڑی میں……
وقت کی ناسمجھ رو ہے
اور بے بسی کی نئی لہر ہے
زمستاں کی اس آخری شام
اور مرے جسم میں
شاید اب کوئی بھی فرق باقی نہیں
میرا ساتھی مری بند آنکھوں کو کس پیار سے چُوم کر کہہ رہا ہے
ارے — آج تو برف باری ابھی سے ہی ہونے لگی
جان! — آؤ مجھے اوڑھ لو!

اُسے کیا خبر ہے
کہ اس وقت میں آگ بھی اوڑھ لُوں تو
مری رُوح پر ہونے والی کوئی برفباری
نہیں رُک سکے گی!

ہجر کی شب کا کسی اسم سے کٹنا مشکل
چاند پورا ہے تو پھر درد کا گھٹنا مشکل

موجۂ خواب ہے وہ اُس کے ٹھکانے معلوم
اب گیا ہے تو یہ سمجھو کہ پلٹنا مشکل

جن درختوں کی جڑیں دل میں اُتر جاتی ہیں
اُن کا آندھی کی دراتی سے بھی کٹنا مشکل

قوّتِ غم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سمٹنا مشکل

اس سے ملتے ہوئے چہرے بھی بہت ہونے لگے
شہر کے شہر سے اک ساتھ نمٹنا مشکل

اب کے بھی خوشوں پہ کچھ نام تھے پہلے سے لکھے
اب کے بھی فصل کا دہقانوں میں بٹنا مشکل

شکستہ پائی ارادوں کے پیش و پس میں نہیں
دل اُس کی چاہ میں گم ہے جو میرے بس میں نہیں

براہِ روزنِ زنداں ہوا تو آتی تھی
کھُلی فضا میں گھٹن وہ ہے جو قفس میں نہیں

قبائے جاں جسے چھُوتے ہی چھینی ہو جائے
وہ شعلگی کسی فصلِ حنا نفس میں نہیں

کسی وصال خبر رُت کی مہرباں آمد
ہمیں قبول — مگر ہجر کے برس میں نہیں

عجیب خواب تھا آنکھیں ہی لے گیا میری
کرن کا عکس بھی اب میری دسترس میں نہیں

دلوں کا حال تو بین السطور لکھتے ہیں
کلیدِ حرف کتابوں کے پیش رس میں نہیں

رستہ بھی کٹھن، دُھوپ میں شدّت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اُس کو محبّت بھی بہت تھی

خیمے نہ کوئی میرے مُسافر کے جلائے
زخمی تھا بہت پاؤں مُسافت بھی بہت تھی

سب دوست مرے منتظرِ پردۂ شب تھے
دن میں تو سفر کرنے میں دِقّت بھی بہت تھی

بارش کی دُعاؤں میں نمی آنکھ کی مل جائے
جذبے کی کبھی اتنی رفاقت بھی بہت تھی

کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹّی میں بغاوت بھی بہت تھی

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

وہ بھی سرِ مقتل ہے کہ سچ جس کا تھا شاہد
اور واقفِ احوال عدالت بھی بہت تھی

اس ترکِ رفاقت پہ پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی

خوش آئے تجھے شہرِ منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

شامِ غریباں

غنیم کی سرحدوں کے اندر
زمینِ نامہرباں پہ جنگل کے پاس ہی
شام پڑ چکی تھی
ہَوا میں کچّے گلاب جلنے کی کیفیت ہے
اور ان شگوفوں کی سبز خوشبو
جو اپنی نوخیزیوں کی پہلی رُتوں میں
رعنائیِ صلیبِ خزاں بنے
اور بہار کی جاگتی علامت ہُوئے ابد تک !
جلے ہُوئے راکھ خیموں سے کچھ کھُلے ہُوئے سر
ردائے عفّت اڑھانے والے بریدہ بازو کو ڈھونڈتے ہیں

بریدہ بازو ـــ کہ جن کا مشکیزہ
نتھے حلقوم تک اگرچہ پہنچ نہ پایا
مگر وفا کی سبیل بن کر فضا سے اب تک چھلک رہا ہے

برہنہ سر بیبیاں
ہَواؤں میں سُوکھے پتّوں کی سرسراہٹ پہ
چونک اُٹھتی ہیں
بادِ صرصر کے ہاتھ سے بچنے والے پھُولوں کو چُومتی ہیں
چھپانے لگتی ہیں اپنے اندر
بدلتے، سفّاک موسموں کی ادا شناسی نے
چشمِ حیرت کو سہم ناکی کا مستقل رنگ دے دیا ہے
نگاہِ تشنیل دیکھتی ہے
چمکتے نیزوں پہ سارے پیاروں کے سر سجے ہیں
کٹے ہُوئے سر
شکستہ خوابوں سے کیسا پیمان لے رہے ہیں
کہ خالی آنکھوں میں روشنی آتی جا رہی ہے!

اِدرکنی

خیمۂ بے گناہی سے میں
شہرِ انصاف کی سمت جونہی بڑھی
اپنی اپنی کمیں گاہ سے
میرے قاتل بھی نکلے
کمانیں کسے تیر جوڑے، طمنچے چڑھائے
مچانوں پہ ناوک بدستوں کو تیّار رہنے کے احکام
دیتے ہُوئے

شاہراہوں میں پیاسی سنانیں لئے فتنہ گر صف بہ صف
چوک پر قاضیٔ شہر خنجر بکف
راستے دشنہ در آستیں

گھات میں شہر کا ہر مکیں
میرے تنہا کجاوے کی آہٹ کو سُنتے ہُوئے
عنکبوتی ہُنر میرے چاروں طرف جال بُنتے ہوئے
کوئی میرے عَلم کا طلبگار
کوئی میرے سر کا خواہاں
تو کوئی ردا کا تمنائی بن کر
جھپٹنے کو ہے
حلقۂ دُشمناں تنگ ہونے کو ہے
موت سے آخری جنگ ہونے کو ہے
کُوفۂ عشق میں
میری بے چارگی
اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے
ہاتھ باندھے ہُوئے
سر جھکائے ہُوئے
زیرِ لب ایک ہی اِسم پڑھتی ہُوئی
یا غفُور الرّحیم!
یا غفُور الرّحیم!

علیؑ مشکل کشا سے!

مولا!
یہ کیسا دُکھ ہے
جس کی گرہیں تجھ سے بھی کھُلنے نہیں پاتیں
تیرے نام کا جادُو اب تک
کیسے کیسے سحر کو کاٹتا آیا
کہاں کہاں گرنے سے بچایا
کیسے کیسے دشتِ بلا میں آبِ تیغ کی پیاس بنا
کس کس کوُفے، کس کس شام میں پامردی کی اساس بنا

لیکن سُورج خوروں کی اس بستی تک آ کر تو
تیرا نام بھی رُک جاتا ہے
فاتحِ خیبر!
اپنے ہاتھوں کو پھر جُنبش دے
ہم اپنی نامرد انا سے ہار چُکے
ساقیٔ کوثر!
ایک دفعہ نظریں تو اُٹھا
دیکھ کہ تیرے ماننے والے
ذرا سی پیاس پہ کیسے فرات کو وار چکے!

تقیّہ

سو اب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہُو کی حُرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سُنا ہے باطل قرار پائے،
وہ سب وفاداریاں کہ جن پہ لہُو کے وعدے حلف ہُوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی

بدن کی وابستگی کا کیا ذکر
رُوح کے عہد نامے تک فسخ مانے جائیں!
خموشی و مصلحت پسندی میں خیریت ہے
مگر مرے شہرِ منحرف میں
ابھی کچھ ایسے غیُور و صادق بقیدِ جاں ہیں
کہ حرفِ انکار جن کی قیمت نہیں بنا ہے
سو حاکمِ شہر جب بھی اپنے غُلام زادے
انھیں گرفتار کرنے بھیجے
تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرۂ نسب بھی روانہ کرنا
اور ان کے ہمراہ مرد پتھر میں چُننے دینا
کہ آج سے جب،
ہزارہا سال بعد ہم بھی
کسی زمانے کے ٹیکسلا یا ہڑپّہ بن کر تلاشے جائیں
تو اس زمانے کے لوگ
ہم کو
کہیں بہت کم نسب نہ جانیں!

جتنا ہو فزوں عطائے رب ہے
تخلیق کا کرب بھی عجب ہے

اس خواب کی لَو کو مت بُجھانا
یہ میرا چراغِ نیم شب ہے

سُورج نے کبھی تو سوچا ہوتا
کیا میرے زوال کا سبب ہے

کب اس کے وصال میں ہُوا تھا
وہ حال جو تیرے دل کا اب ہے

ملنے کا تو مسئلہ نہیں ہے
پہچان بھی پائے، بات تب ہے

خود ڈھونڈ رہا ہے آبِ حیواں
اور پیچھے قبیلہ جاں بلب ہے

بچھڑا ہے جو اک بار تو ملتے نہیں دیکھا
اس زخم کو ہم نے کبھی سِلتے نہیں دیکھا

اِک بار جسے چاٹ گئی دُھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اُس پھُول کو کھِلتے نہیں دیکھا

یک لخت گِرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہِلتے نہیں دیکھا

کانٹوں میں گھِرے پھُول کو چُوم آئے گی لیکن
تتلی کے پَروں کو کبھی چِھلتے نہیں دیکھا

کس طرح مری روح ہری کر گیا آخر
وہ زہر جسے جسم میں کِھلتے نہیں دیکھا

تجھ سے تو کوئی گِلہ نہیں ہے
قسمت میں مری، صِلہ نہیں ہے

بچھڑے تو نجانے حال کیا ہو
جو شخص ابھی مِلا نہیں ہے

جینے کی تو آرزو ہی کب تھی
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

جو زیست کو معتبر بنا دے
ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے

خوشبُو کا حساب ہو چکا ہے
اور پھُول ابھی کِھلا نہیں ہے

سرشاریٔ رہبری میں دیکھا
پیچھے مرا قافلہ نہیں ہے

اِک ٹھیس پہ دل کا پھُوٹ بہنا
چھُونے میں تو آبلہ نہیں ہے!

بدن تک موجِ خواب آنے کو ہے پھر
یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر

ہری ہونے لگی ہے شاخِ گریہ
سرِ مژگاں گلاب آنے کو ہے پھر

اچانک ریت سونا بن گئی ہے
کہیں آگے سراب آنے کو ہے پھر

زمین انکار کے نشے میں گم ہے
فلک سے اک عذاب آنے کو ہے پھر

بشارت دے کوئی تو آسماں سے
کہ اک تازہ کتاب آنے کو ہے پھر

دریچے میں نے بھی وا کر لیے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

جہاں حرفِ تعلّق ہو اضافی
محبّت میں وہ باب آنے کو ہے پھر

گھروں پر جب یہ ہو گی سفیدی
کوئی عزّت مآب آنے کو ہے پھر

فصیلِ شہر پر تھی ضربِ کاری
کماں داروں کا شوقِ شہر یاری

کہاں فن کار کو مر کے بھی حاصل
عذابِ زندگی سے رُستگاری

ہجومِ رنگ میں بھی دل کا مسلک
کسی عہدِ وفا کی پاسداری

اسی چہرے سے اوروں کی پرکھ ہے
ابھی تک ہے وہی اِک شکل پیاری

وہ جب خود ٹوٹنے والا ہُوا تھا
مَیں ہاری بھی تو کیسے وقت ہاری

زمیں ماں کی طرح ہے، ہر ستم پر
بس اِک حرفِ دُعا ہونٹوں سے جاری

ق

کسی بیمار کی بیعت میں روشن
ہماری گردنوں پر سُرخ دھاری

اسیرِ کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

.... بدتر از گنہ

سو یہ طے پایا
کہ اس شہد بھری نیند کا رس
میری آنکھوں کے سوا بھی کوئی پی سکتا ہے
اور وہ سرشاری
جو اب تک کسی منتر کی طرح
صرف مجھے پڑھتی تھی
اب کسی اور بدن کو بھی یونہی وردِ زباں جانے گی
وہی لمحے —— اسی شدّت سے
ترے خوں میں ستاروں کی طرح دمکیں گے

جن کی تنویر ابھی تک مری تقدیر رہی
آج معلوم ہوا،
بند پلکوں کے عقب میں کسی جگنو کی طرح
جس کو چھپا لیتی تھیں تیری پلکیں
وہ مرا عکس نہ تھا ــــ وہ مری تصویر نہ تھی
خوابِ یکتائی کی میرے ــــ کوئی تعبیر نہ تھی
تیرا دلدار تبسم آخر
ناخنِ عذر سے کیا دل کی گرہ کھولے گا
آنکھ جب جھوٹ کہے
آئینہ کیا بولے گا؟

سنگ پگھل بھی جاتے ہیں
جادو چل بھی جاتے ہیں

دیر تلک نم رہنے سے
آنچل گل بھی جاتے ہیں

دو رویہ پیڑوں کے بیچ
رستے جل بھی جاتے ہیں

صرف ہوا پر کیوں تعزیر
پھول مسل بھی جاتے ہیں

بس تریاق نہ کھوج کے بیٹھ
سانپ نگل بھی جاتے ہیں

طاؤسی یادوں کے دُکھ
زخم کو جھل بھی جاتے ہیں

دیکھ اپنی شادابی کو
آنسو پھل بھی جاتے ہیں

دریا پار یہ سوچ کے چل
گھڑے بدل بھی جاتے ہیں

خزاں کی رُت میں لمحۂ جمال کیسے آ گیا
یہ آج پھر سنگھار کا خیال کیسے آ گیا

ہنسی کو اپنی سُن کے ایک بار میں بھی چونک اُٹھی
یہ مجھ میں دُکھ چھپانے کا کمال کیسے آ گیا

وہ رسمِ چارہ سازیٔ جنوں تو ختم ہو چکی
یہ دل کے نام حرفِ اندمال کیسے آ گیا

ابھی تو دُھوپ روزنِ قفس سے کوسوں دُور تھی
ابھی سے آفتاب کو زوال کیسے آ گیا

جدائیوں کے زخم تو، سُنا کہ بھر چلے تھے پھر
بدن کے ہاتھ ناخنِ وصال کیسے آگیا

تمام کائنات ازل سے آئینوں کی زد پہ تھی
ہجومِ عکس میں یہ بے مثال کیسے آگیا

گھر کی یاد ہے اور درپیش سفر بھی ہے
چوتھی سمت نکل جانے کا ڈر بھی ہے

لمحۂ رُخصت کے گونگے سناٹے کی
ایک گواہ تو اس کی چشمِ تر بھی ہے

عشق کو خود دریوزہ گری منظور نہیں
مانگنے پر آئے تو کاسۂ سر بھی ہے

نئے سفر پہ چلتے ہوئے یہ دھیان رہے
رستے میں دیوار سے پہلے در بھی ہے

جن چیزوں کے ہرا رہنے کی دُعا تھی
ان میں آج سے شامل زخمِ ہُنر بھی ہے

بہت سے ناموں کو اپنے سینے میں چھپائے
جلی ہُوئی بستی میں ایک شجر بھی ہے

وہی تیاں کہ آنکھوں تک رہ جائے تو اشک
مصرعۂ تر بن جائے تو سلکِ گہر بھی ہے

سُوکھ گیا خود اپنے دل کی نرمی سے
پیڑ کو کیا معلُوم تھا بیل امر بھی ہے

غزالِ شوق کی وحشت عجب تھی
کسی خوش چشم سے نسبت عجب تھی

ہجومِ چشم و رُخسار و دہن میں
جو تنہا کر گئی صُورت عجب تھی

وہ تردیدِ وفا تو کر رہا تھا
مگر اس شخص کی حالت عجب تھی

مری تقدیر کی نیرنگیوں میں
مری تدبیر کی شرکت عجب تھی

سرِ مقتل کسی کے پیرہن میں
گلابی رنگ کی حدّت عجب تھی

بدن کا پہلے پہلے آگ چکھنا
رگ و پے میں کوئی لذّت عجب تھی

گنگا سے

جُگ بیتے
دجلہ سے اک بھٹکی ہُوئی لہر
جب تیرے پوتّر چرنوں کو چھُونے آئی تو
تیری ممتا نے اپنی باہیں پھیلا دیں
اور تیرے ہرے کناروں پر تب
اننّاس اور کٹھل کے جھُنڈ میں گھِرے ہُوئے
کھپریلوں والے گھروں کے آنگن میں کلکاریاں گونجیں
میرے پرکھوں کی کھیتی شاداب ہُوئی

اور شگن کے تیل نے دیے کی لَو کو اُونچا کیا
پھر دیکھتے دیکھتے
پیلے پھُولوں اور سُنہری دیوں کی جوت
ترے پھُولوں والے پُل کی قوس سے ہوتی ہوئی
مہران کی اور تک پہنچ گئی
مَیں اسی جوت کی ننھّی کرن
پھُولوں کا تھال لیے تیرے قدموں میں پھر آ بیٹھی ہُوں
اور تجھ سے اب بس ایک دیا کی طالب ہُوں
یوں اَنت سمے تک تیری جوانی ہنستی رہے
پر یہ شاداب ہنسی
کبھی تیرے کناروں کے لب سے
اتنی نہ چھلک جائے
کہ میری بستیاں ڈوبنے لگ جائیں
گنگا پیاری!

یہ جان
کہ میرے روپہلے راوی اور بھورے مہران کی گیلی
مٹھی میں
مری ماں کی جان چھپی ہے
مری ماں کی جان نہ لینا
مجھ سے مرا مان نہ لینا!

تاج محل

سنگِ مرمر کی خنک بانہوں میں
حسنِ خوابیدہ کے آگے مری آنکھیں شل ہیں
گنگ صدیوں کے تناظر میں کوئی بولتا ہے
وقت جذبے کے ترازو پہ زر و سیم و جواہر کی تڑپ
تولتا ہے!

ہم نے چاند پہ پتھر و ہی سچ کہتے ہیں
اسی لمحے سے دمک اُٹھتے ہیں ان کے چہرے
جس کی لو، عمر گئے، اک دلِ شب زاد کو مہتاب
بنا آئی تھی!

سدبرگ

اسی مہتاب کی اک نرم کرن
سانچۂ سنگ میں ڈھل پائی تو
عشق رنگِ ابدیت سے سرافراز ہُوا

کیا عجب نیند ہے
جس کو چُھو کر
جو بھی آتا ہے کُھلی آنکھ لیے آتا ہے
سو چکے خوابِ ابد دیکھنے والے کب کے
اور زمانہ ہے کہ اس خواب کی تعبیر پہ جاگ رہا ہے
اب تک!

بوئے یاسمن باقیست

ڈاکٹر سعد ر فراق

سبز دنوں کا سب سے تناور پیڑ
ہوا کے آگے اب بے بس ہے
پتّے اک اک کر کے گرتے جاتے ہیں
وہی شاخ کہ کبھی دلہن کی طرح پھولوں سے لد کر بھی
کیسی نئیلی سرشاری سے تنی رہتی تھی
آج اپنے سب گہنے اتار چکی ہے ـــــ پھر بھی خمیدہ ہے
وہی تنا ـــــ جو برف کے ہر موسم کے بعد
ننھی ننھی ہری ستاروں جیسی کونپلوں سے بھر جاتا تھا
آج اس پر بس چیونٹیاں چلتی نظر آتی ہیں
وہی شگوفے جن سے لپٹ کر دھوپ کبھی ہنستی

تو رنگوں اور کرنوں کے چہرے گڈمڈ ہو جاتے
اس کی بھی ساری پنکھڑیاں رزقِ ہَوا کہلائیں
سبز دنوں کا سب سے تناور پیڑ ــــ
اپنی ہر ممکن ہریالی کما چکا
اور اب خاموشی سے اپنے ہونے کی مجبوری کا
وعدہ معاف گواہ بنا استادہ ہے
اور وقت کی اٹل شہادت پر
اپنے فیصلہ کُن لمحے کا رستہ دیکھ رہا ہے
تنہا ــــ اور تہی داماں
سبز لباسی گئے جنم کی بات ہُوئی
پھر یہ برہنہ شاخوں سے چھن چھن کر
اتنی ٹھنڈی چھاؤں کہاں سے آتی ہے
بن پھولوں کے
خوشبو کیسے پھیل رہی ہے ؟

قرۃ العین حیدر

جیون زہر کو متھ کر امرت نکالنے والی موہنی
بھرا پیالہ ہاتھوں میں لیے پیاسی بیٹھی ہے
وقت کا راہو گھونٹ پہ گھونٹ بھرے جاتا ہے
دیوی بے بس دیکھ رہی ہے !
پیاس سے بیکل ہے ـــــ اور چپ ہے !
ایسی پیاس کہ جیسے
اس کے ساتوں جنم کی جیبھ پہ کانٹے گڑتے رہے ہوں
ساگر اس کا جنم بھون

اور جاں کو ہی سے بیَر

ریت پہ چلتے چلتے اب تو جلنے لگے ہیں پیَر !

ریت بھی ایسی جس کی چمک سے

آنکھیں جھُلس گئی ہیں

طیب رزق کی دُعا قبول ہوئی آخر

آب زر سے نام لکھے جانے کی تمنا بھی بر آئی — لیکن

پیاسی آتما سونا کیسے پی لے ؟

اک سنسار کو روشنی بانٹنے والا سُورج

اپنے برج کی تاریکی کو

کس ناخن سے چھیلے

شام آتے آتے کالی دیوار پھر اُونچی ہو جاتی ہے !

سلمیٰ کرشن

تُو ہے رادھا اپنے کرشن کی
تیرا کوئی بھی ہوتا نام
مُرلی تیرے بھیتر باجتی
کس بن کرتی بسرام
یا کوئی سنگھاسن براجتی
تجھے کھوج ہی لیتے شیام
جس سنگ بھی پھیرے ڈالتی
سنجوگ میں تھے گھنشیام

کیا مول تو من کا مانگتی
بکنا تھا تجھے بے دام
بنسی کی مدھر تانوں سے
بسنا تھا یہ سونا دھام
ترا رنگ بھی کونسا اپنا
موہن کا بھی ایک ہی کام
اِدھر آ کر بھی گئے اور
من مالا ہے وہی نام
جوگن کو پتہ بھی کیا ہو
کب صبح ہوئی کب شام!

میکبتھ

دشتِ شب رنگ کے اک ٹیلے پر
تین ہم ذات چڑیلوں کی ملاقات ہے پھر
اپنے منتر میں کسی نام کو دہراتے ہوئے
سانپ کی آنکھوں سے اطراف و جوانب پہ نظر رکھتے ہوئے
گِدھ کی ناقابلِ تسکین ازلی بھوک کے ساتھ
سُرخ ہونٹوں پہ زباں پھیرتی ہیں
حرفِ تحریص کے زہرابِ ہلاہل ڈبوئی ہوئی خوش لمس نوید

اُس تہی زاد کو دینے کے لیے بیٹھی ہیں
جس کے کیسے میں تشکّر کا کوئی لعل نہیں

ہو چکی طالبِ منصب کو بھی جمشید کلاہی کی خبر
زندگی بھر کی رفاقت کے چلو دام چکے
لیکن اُس تحفۂ گُل نام کا کیا ہو
کہ لرزتے ہوئے ہاتھوں میں ابھی تک ہے —— اور
جس کی خوشبو سے در و بام کے اعصاب تنے جاتے ہیں !

ہنستے دل کی خود آگہی میں
آنکھ میں نیند کہاں
چونکہ آنکھوں کا مقسوم ہی بیداری ہے
نیند جیسی کی طرح تجھ سے کچھ ایسے پچھل باقی ہے

جیسے اس کو کسی بدخواب کی آگاہی ہو
آنکھ کی طرح یہ بے خواب گھڑی
دستِ لرزیدہ پہ بھی آئی ہے
ساحلِ بحرِ عرب کے لب سے
مُشک و عنبر کی طلب ایک عجوزہ کو بھی ہے
ہاتھ پانی میں ہے
اور آنکھ میں در آئی ہے
ساری دُنیا کے سمندر کی تلاش!

اے مرے شہرِ رسن بستہ

اے مرے شہرِ رسن بستہ۔ ترے بازو کے نیل
اتنے گہرے ہو چکے ہیں اب
کہ تیری رُوح پر دکھنے لگے
اور ترے ماتھے پہ کوئی بل نہیں!
مَیں ترے طرزِ توکّل پر بہت حیران ہُوں!
ان اذیّت ناک نیلی دھاریوں کو
کیا کلاہِ زخم زدہ میں
تمغۂ نیلوفری سمجھا ہے تُو؟

اس قدر سفّاک لمحوں کے نشانوں سے بھری اس پیٹھ کو
کس نے پُشتِ لاجوردی کہہ کے بہلایا تجھے ؟
یا اسے بھی اِک عطائے خُسروی سمجھا ہے تُو ؟
یہ تو تیری سات پُشتوں کے لیے وہ تازیانہ ہے
کہ جس کے گھاؤ
جب بھرنے کو آئیں گے
تو تیرے حافظے کے سارے ناخن یک بیک بڑھ
آئیں گے !

شہر یاروں کے نشاطِ حُسن بازی کے لیے
سجدہ گاہِ عشق کو رُسوا نہ کر
روشنی کی بے رُخی پر کور چشمی کو رضائے رب نہ کہہ
اپنے تارے کو تلاش
اپنی کم گوشی کی دُھن میں زندگی کے بے صدا ہونے پہ
مت اصرار کر
پاؤں آ کر تو ہر زنجیر بول اُٹھتی ہے دوست

دیر بس ہلنے کی ہے
رُوح کے پھلنے کی ہے
اک دفعہ بس چوٹ کی گہرائی کوئی جان لے
ایک لمحے کے لیے رُسوائی کے آسیب کو پہچان لے !
ایک بار احساس آنکھیں مل کے اُٹھ جائے تو پھر
تجھ کو گہنوں کی طرح پہنی ہُوئی زنجیر بھی بھاری لگے
صحنِ زنداں سے اُدھر کی زندگی پیاری لگے !

وَاُوفَ بِعَہدِکَ

(حضرت امام حسینؑ کے آخری الفاظ)

کنارِ دریا
اب آخری بار رَن پڑا ہے
عَلم کی نصرت کو جانے والے وہی جری پاس بچ رہے ہیں
کہ جو مری ذُرّیت میں ہیں،
اور جاں سپاری
جنھیں اب وجد سے ورثۂ افتخار بن کر عطا ہوئی ہے!
لڑائی کی رات
گفتگو میں وہ لمحہ آیا تھا
جبکہ مَیں اپنے خیمے کے سب دِیے بُجھا کر چلا گیا تھا۔

مرے رفیقوں کی مشکلیں کچھ تو سہل تر ہیں
مگر چراغوں کی لو بڑھانے کے ساتھ ہی
فیصلے کی ساعت گزر چکی ہے
مبارزت کی نوید میرے شجیع لوگوں کو مل چکی ہے
مرے براول جوان ایک ایک کرکے کام آ رہے ہیں
مجھ کو . . . یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہو چکی ہے
کہ میرا پرچم ہوا کے آگے زیادہ عرصے نہیں رکے گا!
سبھی طرف سے غنیم گھیرے کو تنگ تر کرتا جا رہا ہے
یہ ہاتھ سے ڈھال چھوٹنے کی صدا مجھے کس طرف سے آئی
گماں ہے شاید مرا کوئی شہسوار گھوڑے سے گر گیا ہے!
مرے یمین و یسار نیزوں کی زد پہ ہیں
میرا قلب پہلے ہی برچھیوں سے چھدا پڑا ہے
عقب تک اب تو بجھے ہوئے تیر آ رہے ہیں!
وہ رن پڑا ہے کہ صحنِ مقتل ہماری لاشوں سے پٹ گیا ہے
برہنہ لاشوں کو اب تو گھوڑے بھی روند کر آگے جا چکے ہیں

یں بکھرے ٹکڑوں کو جمع کرتے
بریدہ سر سے بدن کی نسبت تلاش کرتے
کنارۂ زرقِ تک شکستہ ہُوں ـــــ تھک گیا ہُوں
بہت کڑا وقت ہے کہ اس مجمعِ عزیزاں میں آج تنہا کھڑا
ہُوا ہُوں!

تمام زخموں سے چُور رہُوں میں
مگر شہادت گہِ وفا میں
لہُو سے رسمِ وضو کی تکمیل کرنے سے قبل
اپنے سجدے کی مستجابی کی تہنیت مجھ کو مل چکی ہے!
مرا یہ اعزاز کم نہیں ہے
کہ اتنے تیروں میں ایک بھی تیر وہ نہیں تھا
کہ جو کسی پُشت سے نکالا گیا ہو
ہنگامِ عصر ـــــ مقتل سے سرخرُو ہُوں
کہ میرے توشے میں جتنے وعدے تھے ـــــ اتنے سر ہیں!

کسے کہ کشتہ نہ شد

سنا ہے خسروِ دوراں کی کج کلاہی کو
کشیدہ قامتیِ عصر خوش نہیں آئی
بزن کے حکم سے لرزاں چلا جو ہرکارہ
تو اپنے منصبِ عقبیٰ شکار سے آگاہ
ارادۂ شہِ والا معتبر کرنے
فقیہِ شہر مناسب جواز لے آیا
طلائی طشت میں تازہ گلاب سجنے لگے
ذرا اٹھے تھے کہ نیزوں پہ سر پہنچنے لگے

عبا و جبّہ و دستار بے ہُنر ٹھہرے
ازل کے کورِ نظر آج دیدہ ور ٹھہرے
کنارہ کرتے ہُوئے دوست شرمسار نہیں
وہ ابتلا ہے کہ سائے کا اعتبار نہیں
وہ تیرگی ہے کہ اُمیدِ اجر دل میں نہیں
دُعائیں مانگتے ہیں اور صبر دل میں نہیں
مگر وہ لوگ کہ جن کا یقین زندہ تھا
اُمیدِ اجر پہ جن کا چراغ جلتا تھا
وہ ایک نام کی نسبت سے معتبر اب بھی
وہ ایک زخم کے رشتے سے دوست تر اب بھی
نہ ان کو تخت سے طلب نہ لوٹ کی خواہش
نہ مصلحت کی سیاست نہ جاہ سے سازش
نجابتوں کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں
درونِ شہر جہاں جشنِ قتلِ عام ہُوا

حضورِ شاہ سبھی جاں گزارنے آئے
زباں کا قرض نہوتے اُتارنے آئے
ہوا نے جتنے دِیے مانگے نذر کر ڈالے
کہ روشنی کا نسب صرف بام و در سے نہ تھا
اور آنے والی کسی سرد رات کی خاطر
کوئی چراغ بچا تھا — تو میرے گھر سے نہ تھا!

اے جگ کے رنگ ریز

اے جگ کے رنگ ریز
مری بھی اوڑھنی رنگ دے
میں پنگھٹ پر کیسے جاؤں
بھیگے پلّو سے ہاتھوں کو بچاتی سکھیاں
مجھ پر ہنستی ہیں!
میں نے سو سو جتن کیے
پر مجھ پر رُوپ نہ آیا
کیسر پنکھڑی، حنا کے پتّے، ہار سنگھار کے ڈنٹھل
اور کُسم کے پھول

سب آنچل میں بندھے رہ گئے
کوئی مرے کام نہ آیا
گہنے پاتے گئے اکارت

پی کا پیار بھی مری کایا بدل نہ پایا
رہی مری چُنری پھیکی کی پھیکی
ہاں ــــ بس اک رُت ایسی آئی تھی
جب مجھ پر ہریالی ٹوٹ کے چھائی تھی
تن کے سُندر بن میں ساتوں رنگ کے پھُول کھِل اُٹھے تھے !
لیکن پہلی ہی بارش میں
جل گئے سارے پھُول
ایک ذرا سی دُھوپ ہوئی
اور پل بھر میں سب دُھول
دُھوپ کڑی تھی یا پھر رنگ ہی کچّے تھے
اب تک جان نہ پائی
بس اتنا بھر دیکھ سکی ہُوں
لے جگ کے رنگ ریز !

تری مٹھی میں دھنک ہے

بادل، جل، آکاش، چندرما، کمل، چنبیلی، دوب

اُودا، اُجلا، نیلا، پیلا، سُرخ، روپہلا، سبز

اتنے سارے رنگوں میں

میرے نام کا کوئی رنگ تو ہوگا

خسرو مُرشد!

اپنے ہاتھ سے میرے تن پر مل دے

اور جو تجھے یہ بھی نہ سہائے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ لے!

اپنے قائدؒ کے لیے کچھ حرف

بے آب آئنوں پہ طلسمِ نظر کھُلا
چشمِ فسوں زدہ سے کوئی خواب گر کھُلا

اک شخص کو کلیدِ محبّت عطا ہُوئی
تنہائیوں پہ شہرِ رفاقت کا در کھُلا

اک سرخوشی میں چلتے رہے اُس کے ساتھ ساتھ
منزل پہ آ گئے تو کمالِ سفر کھُلا

ٹھنڈا ہُوا اِدھر علمِ جاں فروشگاں
شہرِ وفا میں رُوح کا پرچم اُدھر کھُلا

اک حرفِ سبز شاخِ بدن پر چمک اُٹھا
میری زمیں پہ اپنے لہُو کا ہنر کھُلا

ننھّے سے اک ستارے کی کیا روشنی مگر
پرچم پہ آگیا تو بہت چاند پر کھُلا

وہ وقت تھا کہ تھی بھی ضروری ردائے سبز
آندھی میں کون دیکھتا مٹّی کا سر کھُلا

لمسِ زر

کیمیاگر یہ کہتے ہیں
بعض شرابیں اپنے وصف میں اتنی عجیب ہوتی ہیں
کہ جب تک
جام سفالیں میں رکھی جائیں
تو ان کا نشہ
اپنے خمار تک
مے خواروں کے حق میں امرت رہتا ہے
اور جیسے ہی سونے کے پیالوں میں انڈیلی جائیں

تو امرت ــــ زہرِ ہلاہل بن جاتا ہے
آج اپنے محبوب ــــ مگر مرحوم سخن ور کوئیں نے
جب کرسئ اعلیٰ پر بیٹھے
اور تیسرے درجے کے مہمل اشعار سناتے دیکھا تو،
مجھ کو یہ معلوم ہُوا
ایسی عجیب شرابوں میں
ایک شرابِ سخن بھی ہے!

مارگزیدہ

معصومیت اور حماقت میں پل بھر کا فاصلہ ہے!
میری بستی میں پچھلی برسات کے بعد
اک ایسی اعصاب شکن خوشبو پھیلی ہے
جس کے اثر سے
میرے قبیلے کے سارے زیرک افراد
اپنی اپنی آنکھوں کی جھلّی مٹیالی کر بیٹھے ہیں
سادہ لوح تو پہلے ہی
سرکنڈوں اور چنبیلی کے جھاڑوں کے پاس

بے سُدھ پائے جاتے تھے
دہن کے اندر گھُلتے ہی
نیم کے پتّوں کا یوں برگِ گلاب ہو جانا تو مجبُوری تھی
حیرت تو اس بات پہ ہے کہ
آگ کے پودوں کی موجودگی کے باوصف ،
وارثِ تسنیم و کوثر
ایسی لعاب آلُود مٹھاس کو آبِ حیات سمجھ بیٹھے ہیں
معصُومیّت اور حماقت میں پل بھر کا فاصلہ ہے !

—— تو برمن بلا شُدی

کچّے ذہن اور کچّی عُمر کی لڑکیاں
اپنی خُوبی میں
مائع جیسی ہوتی ہیں
جس برتن میں ڈالی جائیں
اُسی شکل میں کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں!
کیسا چھلکنا۔ کیسا اُبلنا اور کہاں کا اُڑنا!
اور اک میں ہوں — پتھر اور شوریدہ مزاج!
کاسۂ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے
اُس سے اس قوّت سے ٹکرانا چاہتی ہوں کہ
ظرفِ تہی کی گُونج سے اس کا بھرم کُھل جائے!

میں نے آئینے کو کب جھٹلایا ہے!
ہاں — گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں
لیکن جب بھی مجھ کو ان کا مول کبھی یاد آتا ہے تو
کنگن بچھو بن جاتے ہیں
اور پازیبیں ناگ کی صورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں!
بہت ہی میٹھے بولوں کا جزوِ اعظم
جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آجاتا ہے
دہشت سے مری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں
اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی جمنے لگتی ہے کہ
ان ہی مادر زاد منافق لوگوں میں
مجھ کو ساری عمر بسر کرنی ہے!

کبھی کبھی ایسا بھی ہُوا ہے
میں نے اپنا ہاتھ اچانک کسی اور کے ہاتھ میں پایا
لیکن جلد ہی میری ضرورت سے زاید بے رحم بصارت نے
یہ دیکھ لیا ہے

یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے

یا پھر مٹّی پر

اُس کے پنجے اُس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں

انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہوتی جاتی ہے !

شام کے ڈھل جانے کے بعد

جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں

میں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھر جاتی ہوں

اور اپنی چادر پر تازہ دھبّے بنتے دیکھتی ہوں

کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی کہنا

نہیں آتی

میں ــــ آقائے ولی نعمت کو

خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہوں !

ظلِّ الٰہی کے پرابلمز

راج پاٹ کرنے والوں کی جان
ہتھیلی پر رہتی ہے
بے چاروں کے مسائل کیسے عجب ہوتے ہیں
کبھی اس باجگزار ریاست کی شوریدہ سری
کبھی اُس زیرِ نگیں صُوبے کی نافرمانی
کبھی خود پایۂ تخت کے اندر غیر مناسب بیداری
کبھی سپہ سالارِ اعظم کا شوقِ لشکر آرائی
کبھی امیرِ مطبخ کی خاصے میں خاصی غیر ضروری دلچسپی

شہزادوں کی شورہ پشتی
حرم سرا میں پلنے والی چھوٹی بڑی سیاست
بالاعلان بغاوت، درپردہ سازش!

دشمن جلد ہی کھل جاتے ہیں
ان سے نبٹنا اتنا مشکل کام نہیں
الجھاوا تو پاؤں چومنے والوں سے پڑتا ہے!
اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں
ایک تو کتے ——
اپنی وفاداری میں شہرۂ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھر اپنی اپنی ہڈی لے کر الگ ہو جاتے ہیں
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے
یہ دو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو ایسا کر دیتے ہیں کہ

ایک سُہانی صُبح کو جب
اپنی کنیزِ خاص کی بھیروں سُن کر آنکھیں کھولتے ہیں تو
ظلِّ الٰہی
اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں !

اسی طرح سے ہر اک زخم خوشنما دیکھے
وہ آئے تو مجھے اب بھی ہرا بھرا دیکھے

گزر گئے ہیں بہت دن رفاقتِ شب میں
اک عمر ہو گئی چہرہ وہ چاند سا دیکھے

مرے سکوت سے جس کو گلے رہے کیا کیا
بچھڑتے وقت ان آنکھوں کا بولنا دیکھے

ترے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے

بس ایک ریت کا ذرّہ بچا تھا آنکھوں میں
ابھی تلک جو مُسافر کا راستہ دیکھے

اُسی سے پوچھے کوئی دشت کی رفاقت — جو
جب آنکھ کھولے پہاڑوں کا سلسلہ دیکھے

تجھے عزیز تھا اور میں نے اُس کو جیت لیا
مری طرف بھی تو اک پل ترا خُدا دیکھے

موجیں بہم ہُوئیں تو کنارہ نہیں رہا
آنکھوں میں کوئی خواب دوبارہ نہیں رہا

گھر بچ گیا کہ دُور تھے، کچھ صاعقہ مزاج
کچھ آسمان کا بھی اشارہ نہیں رہا

بھُولا ہے کون ایڑ لگا کر حیات کو
رُکنا ہی رخشِ جاں کو گوارا نہیں رہا

جب تک وہ بے نشاں رہا، دسترس تھا
خوش نام ہو گیا تو ہمارا نہیں رہا

گُم گشتۂ سفر کو جب اپنی خبر ملی
رستہ دکھانے والا ستارہ نہیں رہا

کیسی گھڑی میں ترکِ سفر کا خیال ہے
جب ہم میں لوٹ آنے کا یارا نہیں رہا

جذبہ

گُڑیا سی یہ لڑکی
جس کی اُجلی ہنسی سے
میرا آنگن دمک رہا ہے
کل جب سات سمندر پار چلی جائے گی
اور ساحلی شہر کے سُرخ چھتوں والے گھر کے اندر
پُورے چاند کی روشنی بن کر بکھرے گی
ہم سب اس کو یاد کریں گے
اور اپنے اشکوں کے سچے موتیوں سے
ساری عُمر
اک ایسا سُود اُتارتے جائیں گے،
جس کا اصل بھی ہم پر قرض نہیں تھا!

کنیّادان

بال صندل کے پانی میں بھیگے ہُوئے
جسم چیندن کے مس سے دمکتا ہُوا
آنکھ خوابوں کی افشاں سے بوجھل بہت
ہونٹ پر اَن کہی کا مزہ !
گوری گوری کلائی سے لپٹی ہُوئی موتیے کی لڑی
سُرخ زرتار جوڑے میں سمٹی ہُوئی ایک کچّی کلی
گاہے گاہے جھلکتی ہُوئی مُوہنی شکل وہ چاند سی
چُوڑیوں کی کھنک
اور پائل کی چھن چھن سے چھنتی ہُوئی
کیسی پیاری ہنسی
تس پہ سکھیوں کی وہ چھیڑ کہ
آئینے سے بھی نظریں ملائی نہیں جا سکیں !

شامیانے کے پرلی طرف
وقت کے جبر کے سامنے
چُپ کھڑی مامتا ——
جس کے چاروں طرف
تشنہ جبڑوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں، بدن گیر
غرّاہٹوں کا عجب غول ہے

اور اسی غول سے
اپنی نازوں کی پالی کی خاطر
بڑے صبر سے
ایک مجبور ہرنی کی صورت وہ چھین لائی ہے
اک ذرا کم ضرر بھیڑیا!

ہاں — ابھی دُعائے نُور پڑھی جا سکتی ہے

ہاں — ابھی دُعائے نُور پڑھی جا سکتی ہے
ردّ بلا کے اسم ابھی تک اپنی تاثیروں سے منافق نہیں ہوئے
حرفِ دُعا میں آس کی لَو تابندہ ہے!
ٹوٹنے والی سانسوں کا اک تار
کسی ان دیکھے مسیحا کے ہاتھوں میں جھوُل رہا ہے
دو دُشمن دُنیاؤں کے مابین زمینِ بے ملکیت کی حد پہ
کوئی خزاؤں جیسا ذہن
رہ رہ کے کچھ بھُول رہا ہے

آنکھوں پر اس لمحۂ آخر کی سیّال روپہلی جھلّی چڑھنے لگی ہے
جس کو چھُونے سے سُورج کے ہاتھ بھی
برف کے ہو جائیں گے
آنے والوں کی صُورت کجلانے لگی ہے
پھر بھی آنکھیں ہیں کہ دروازے سے لگی ہیں !
کوئی نجات دہندہ — شافعِ روزِ قیامت
کوئی سب باتوں کا جاننے والا — میرے علیم و خبیر
کوئی معجزے والا ہاتھ — اے مُوسیٰ کے خُدا
کوئی جِلانے والی سانس — اے ربِّ عیسیٰ
کوئی محبّت والی آنکھ — اے محبُوبِ محمدؐ !

نہیں — میرا آنچل میلا ہے

نہیں — مرا آنچل میلا ہے
اور تیری دستار کے سارے پیچ ابھی تک تیکھے ہیں
کسی ہوا نے ان کو اب تک چھونے کی جرأت نہیں کی ہے
تیری اُجلی پیشانی پر
گئے دنوں کی کوئی گھڑی
پچھتاوا بن کے نہیں پھوٹی
اور میرے ماتھے کی سیاہی
تجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی

اچھّے لڑکے
مجھے نہ ایسے دیکھ
اپنے سارے جگنو سارے پھُول
سنبھال کے رکھ لے
پھٹے ہُوئے آنچل سے پھُول گر جاتے ہیں
اور جگنو
پہلا موقع پاتے ہی اُڑ جاتے ہیں
چاہے اوڑھنی سے باہر کی دُھوپ کتنی ہی کڑی ہو!

ایران

اک اُلّو، اک ریچھ اور اک ہاتھی
شطرنج کے رسیا تھے
آپس میں جانی دشمن تھے
لیکن اپنے شوق کے آگے بے بس تھے
ایک ہی میز پہ بیٹھ کے پہروں کھیلتے تھے
کبھی کبھی کوئی لومڑ، کوئی گدھا یا کوئی عقاب بھی
مہرے بدلنے میں
ان کی حسبِ حکم مدد کر دیتا تھا

کبھی بے چاری فاختہ تک پیادوں کے ساتھ پس جاتی
چھوٹی موٹی چِڑیاں تو کس شمار میں تھیں
کھیل کی لت بھی طاقت کے نشّے جیسی ہے
پہلا شب خوں عقلِ سلیم پہ پڑتا ہے
سو اک دن ایسا کرنا ہُوا کہ
سب سے بڑے شاطر کا مسئلہ
حسبِ توقع نکل پڑا
تینوں نے اپنا مستقبل سوچا
اور شیر ببر کو اپنا گواہ ٹھہرایا
اس کے کچھ اسباب بھی تھے

اُلّو کے بچّے جنگل میں سوتے تھے
ریچھ کو شہد کے لیے کچھار سے ہو کے گزرنا پڑتا تھا
ہاتھی کو لانے رمبھا سمبھا کے لیے
گندم اور آلو کے کھیت چھوٹے پڑتے تھے
شیر بیچارہ ــــــ بھلا اُمورِ ملک سے اس کو کب فرصت

ابھی انکار کا پہلا حرف ہی کہہ پایا تھا
تینوں نے اک دوسرے کی جانب دیکھا
اور جناب والا کو ہی داؤ پہ رکھ کے کھیل دیا
ہار جیت کے فیصلے سے پہلے ہی
بساطِ خونی پر سے
فیل، پیادے، شاہ، وزیر سب بٹے ہوئے تھے
شیر کے ٹکڑے خانہ خانہ بٹے ہوئے تھے!

زمیں سے رہ گیا ہے دُور آسمان کتنا
ستارہ اپنے سفر میں ہے خوش گُمان کتنا

پرندِ پیکاں بدوش پرواز کر رہا ہے
رہا ہے اس کو خیالِ صیادگان کتنا

ہَوا کا رُخ دیکھ کر سمندر سے پوچھنا ہے
اُٹھائیں اب کشتیوں پہ ہم بادبان کتنا

بہار میں خوشبوؤں کا نام و نسب تھا جس سے
وہی شجر آج ہو گیا بے نشان کتنا

گرے اگر آئنہ تو اک خاص زاویے سے
وگرنہ ہر عکس کو رہے خود پہ مان کتنا

بنا کسی آس کے اُسی طرح جی رہا ہے
بچھڑنے والوں میں تھا کوئی سخت جان کتنا

وہ لوگ کیا چل سکیں گے جو اُنگلیوں پہ سوچیں،
سفر میں ہے دُھوپ کس قدر سائبان کتنا

زمیں پہ پاؤں تھے، قیام آسماں میں تھا
مری طرح سے وہ شخص بھی امتحان میں تھا

یہ روشنی تھی کہ اس کا چہرہ دھیان میں تھا
ستارہ سا اک چراغ میرے مکان میں تھا

کہ چاند خود آکے ایک تارے کا نام پُوچھے
ہجومِ سیارگاں! یہ کس کے گُمان میں تھا

مَیں اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہُوں تو سوچتی ہُوں
نظر کا ایسا طلسم کس داستان میں تھا

میں اس کی کشتی سے اپنا آنچل ہٹا کے سمجھی
سفر کا بھی حوصلہ فقط بادبان میں تھا

دعا کبھی میں نے مانگی تھی دونوں وقت ملتے
یہ زندگی بھر کا جھٹپٹا کب دھیان میں تھا

جدائی کا فیصلہ تو پھر بھی ہمارا ہوتا
یہ مان بھی لیں اگر کوئی درمیان میں تھا

قدموں میں بھی تکان تھی گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کے سفر ہی عجیب تھا

نکلے اگر تو چاند دریچے میں رُک بھی جائے
اس شہرِ بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

آندھی نے اُن رُتوں کو بھی بے تاج کر دیا
جن کا کبھی ہُما سا پرندہ نصیب تھا

کچھ اپنے آپ سے ہی اُسے کشمکش نہ تھی
مجھ میں بھی کوئی شخص اُسی کا رقیب تھا

پُوچھا کسی نے مول تو حیران رہ گیا
اپنی نگاہ میں کوئی کتنا غریب تھا

مقتل سے آنے والی ہوا کو بھی کب ملا
ایسا کوئی دریچہ کہ جو بے صلیب تھا

چھتنار

اے رے پیڑ، ترے کتنے پات
اتنے
جتنے گگن میں تارے
یا جتنے بن میں پھول
جتنی ساگر کی لہریں
جتنی مری مانگ کی دھول؟
تیری سندر ہریالی کا اور نہ چھور کوئی
جگ کی دھوپ تری چھایا سے چھوٹی ہے

میں تیرے سائے میں جیسے مٹتی جاؤں
اپنے دُکھتے ماتھے، جلتی آتما پر سے
شبنم چُنتی جاؤں

اے رے پیڑ، ترے کتنے ہاتھ؟

سبھی گناہ دھل گئے سزا ہی اور ہو گئی
مرے وجود پر تری گواہی اور ہو گئی

رفوگرانِ شہر بھی کمال لوگ تھے مگر
ستارہ ساز ہاتھ میں قبا ہی اور ہو گئی

بہت سے لوگ شام تک کواڑ کھول کر رہے
فقیرِ شہر کی مگر صدا ہی اور ہو گئی

اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ سازگار تھا
چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہو گئی

بہت سنبھل کے چلنے والی تھی پر اب کے بار تو
وہ گُل کھِلے کہ شوخیٔ صبا ہی اور ہو گئی

نجانے دُشمنوں کی کون بات یاد آگئی
لبوں تک آتے آتے بد دُعا ہی اور ہو گئی

یہ میرے ہاتھ کی لکیریں کھُل رہی تھیں یا کہ خود
شگن کی رات خوشبوئے حنا ہی اور ہو گئی

ذرا سی کرگسوں کو آب و دانہ کی جو شہ ملی
عقاب سے خطاب کی ادا ہی اور ہو گئی

سحاب میں تھی تو وہ بھی صبا مثال ہی تھا
کسی کے واسطے رُکنا ذرا محال ہی تھا

ہزار آئینے جس جا ہوں روکشِ خورشید
نگاہ بھر کے اُسے دیکھنا کمال ہی تھا

یہ کیا کہ بکنے لگے قصر و کاخِ پرویزی
گدائے عشق کے کیسے میں اک سوال ہی تھا

بچھڑ کے وہ مجھے لوٹا گیا ہے میرا وجود
یہ سانحہ مرے حق میں تو نیک فال ہی تھا

پرند اپنی رضا سے زمین پر اُترا
وگرنہ ایسی ہَوا تھی نہ ایسا جال ہی تھا

ہرا رکھا مجھے جس نے بہ وصفِ چارہ گراں
وہ مُعجزہ مرا اندوہِ اندمال ہی تھا

قید میں گزرے گی جو عمر بڑے کام کی تھی
پر میں کیا کرتی کہ زنجیر ترے نام کی تھی

جس کے ماتھے پہ مرے بخت کا تارہ چمکا
چاند کے ڈوبنے کی بات اسی شام کی تھی

میں نے ہاتھوں کو ہی پتوار بنایا ورنہ
ایک ٹوٹی ہوئی کشتی مرے کس کام کی تھی

وہ کہانی کہ ابھی سوئیاں نکلی بھی نہ تھیں
فکر ہر شخص کو شہزادی کے انجام کی تھی

یہ ہَوا کیسے اُڑا لے گئی آنچل میرا
یوں ستانے کی تو عادت مرے گھنشام کی تھی

بوجھ اُٹھائے ہوئے پھرتی ہے ہمارا اب تک
اے زمیں ماں! تری یہ عُمر تو آرام کی تھی

پلکیں نہ جھپکتی تھیں کہ گفتار عجب تھی
آنکھوں کے لیے ساعتِ دیدار عجب تھی

خاموش تھے لب صورتِ اقرار عجب تھی
کیا کہیے صفائی میں کہ سرکار عجب تھی

پھر جمنے لگے دیکھ مرے پاؤں زمیں پر
غربت میں ترے شہر کی دیوار عجب تھی

امکانِ بہاراں سے بھی دل کٹنے لگا تھا
اور برگِ تمنّا بھی کچھ دھار عجب تھی

صحرا میں پلٹ کے میں کسے دیکھتی لیکن
آواز سی اک زمزمہ آثار عجب تھی

جھکتی ہی گئی زعم میں دیوار کے اس پار
تقدیر تری شاخِ ثمردار عجب تھی

اک لمحۂ پرّاں کی بھی قیمت نہیں چھوڑی
یہ سلطنتِ درہم و دینار عجب تھی

دستار کے بل گِن کے جہاں ملتی ہو عزّت
اس شہر میں توقیرِ سخن کار عجب تھی

ہوا نژاد اور آج ہے گوشہ گیر ایسا
رگِ گلو میں ہُوا ہے پیوست تیر ایسا

نہ آپ کُھلتا نہ میرا احوال پوچھتا ہے
رہِ وفا میں یہ مل گیا کون میر ایسا

بندھے ہُوئے ہاتھ کا بھی اس کو ملال کب ہے
شریکِ پرواز کر رہا ہے اسیر ایسا

نہ مٹ سکے گا کوئی مِرے شیشہ گر سے کہہ دے
جو فاصلہ پڑ گیا دلوں میں لکیر ایسا

میں دونوں ہاتھوں کو چھوڑ کر چل رہی ہوں پھر بھی
سہارا دے کھڑا ہے اک دستگیر ایسا

چٹان چھوڑ کے شاہین میں یہاں آیا
اور عمر بھر کی ریاضت پہ خاک ڈال آیا

سگان راہ و طفلان شہر کیا کرتے
فقیہہ وقت تو دستار خود اچھال آیا

ستارہ پہلے کبھی اس قدر نہ تھا روشن
یہ کون ہاتھ مرے بخت کو اجال آیا

زمانے نے جسے بے تیشہ کر دیا تھا کبھی
پہاڑ کاٹ کے خود راستہ نکال آیا

یہی نہیں کہ مجھے اس نے تھام رکھا ہے
مرا خیال بھی اس کو کبھی سنبھال آیا

ستارہ داں! تُو مرا زائچہ دوبارہ دیکھ
ترے کہے میں نہ آیا، عجیب سال آیا

یہ کس کا سامنا کرنے سے حرف لرزاں ہیں
سخن شناسوں میں یہ کون باکمال آیا

کفِ گلاب سے خوشبو ہی چُن سکا تو بہت
جو میرے گھر میں ہمیشہ ہَوا مثال آیا

کوئی ستارہ مرے ساتھ ساتھ چلنے لگا
سفر میں جیسے ہی مجھ کو ترا خیال آیا

بہاؤ تیز تھا طوفانِ ابر و باد بھی تھا
فصیلِ شہر سے دریا کو کچھ عناد بھی تھا

غُبار ہونے سے پہلے ہَوا کو یاد بھی تھا
سوادِ سنگ میں اک آئنہ نژاد بھی تھا

ہزار بار ہوئی بند جس پہ شہر پناہ
سُنا گیا ہے کہ وہ شخص شہرزاد بھی تھا

جو بے نیازِ ستائش بنا رہا تھا مجھے
اسی کے ہاتھ میں دیکھا تو سنگ بنیاد بھی تھا

ہزار ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس رہی
میں آئینہ تھی، بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا

اِک ایسے گھر کا ٹھہرنا تو معجزہ سمجھیں
جو بے ستُون بھی تھا اور کج نہاد بھی تھا

وہ باکمال کہ اتمامِ عشق جس پہ ہُوا
بنامِ حسن اِسے حقِّ اجتہاد بھی تھا

قضا نے مرے نام کی لوح بھر دی
مری جان! تو نے بہت دیر کر دی

زمیں کرۂ زمہریری میں آئی
فضا میں ہے پت جھڑ سے پہلے کی زردی

قفس کی تو خود تیلیاں مڑ گئی ہیں
پرندے کو کس نے نوید سفر دی

یہ کیسے شکاری نے جکڑا ہے مجھ کو
کہ خود میں نے اڑنے کی خواہش کتر دی

ہوائے زمستان نے کیا گل کھلائے
دم واپسیں شاخ کی گود بھر دی

اسی سے طلب حرفِ آخر کی رکھوں
دہی جس نے توفیقِ عرضِ ہنر دی

ہَوا کی طرح سے نہیں اختیاری
کسی بے ٹھکانہ کی آوارہ گردی

محبّت کی تاریخ میں کب نئی ہے
کسی آبلہ پا کی صحرا نوردی

حسابِ عداوت بھی ہوتا رہے گا
محبّت نے جینے کی مہلت اگر دی

میں پھر خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
رضائے الٰہی کی تکمیل کر دی

شام! میں توری گیّاں چراؤں

آنکھ جب آئینے سے ہٹائی
شام سُندر سے رادھا مل آئی
آئے سپنوں میں گوکل کے راجہ
دینے سکھیوں کو آئی بدھائی
پریم جل خوب گاگر میں بھر لوں
آج بادل نے مایا لُٹائی
کس کو پنگھٹ پہ جانے کی ضد تھی
کس سے گاگر نے بِنتی کرائی

اوک سے پانی بہنے لگا تو!
پیاس گردھر کی کیسے بجھائی
اب تو جل کا ہی آنچل بنا لوں
پیڑ پہ کیوں چنریا سکھائی
اسی بالک سے ندیا ملے گی
جس نے ماتھے کی بندیا چرائی
رنگ ڈالی مری آتما تک!
کیا منوہر کے من میں سمائی
میں نے سکھیوں کو کب کچھ بتایا
بیری پائل نے ہی جا لگائی
گوپیوں سے بھی کھیلیں کنہیا
اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی
کوئی خوشبو تو اچھی لگے گی!
پھول بھر بھر کے آنچل میں لائی
شام! میں توری گیاں چراؤں
مول لے لے تو میری کمائی

کرشن گوپال رستہ ہی بھولے
رادھا پیاری تو سدھ بُھول آئی
سارے سُر ایک مُرلی کی دُھن میں
ایسی رچنا بھلا کس نے گائی؟
کیسا بندھن بندھا شام موئے
بات تیری سمجھ میں نہ آئی
ہاتھ پھُولوں سے پہلے بنے تھے
یا کہ گجرے سے پھُوٹی کلائی!

A WOMAN'S PRIDE

اس کی ہتھیلی پر میرے آنسو
کتنے اچھّے لگتے ہیں
جیسے صبح سویرے
کنول کی پنکھڑیاں
شبنم سے جگمگ کرتی ہوں
موتی جیسی شبنم ——
پھول کی آنکھوں میں جا کر ہیرے کی کنی بن جاتی ہے
قطرہ قطرہ دل کٹتا ہے
خوشبو دھیرے دھیرے تن میں پھیلتی ہے
شبنم پھولوں کے رنگ میں آخر رنگ جاتی ہے
ننھے ننھے چراغوں کی لَو بڑھتی ہے تو
اُس کا چہرہ پہلے سے بڑھ کر روشن لگنے لگتا ہے
اُس کی آنکھوں میں میرے آنسو
کتنے اچھے لگتے ہیں!

شب وہی لیکن ستارہ اور ہے
اب سفر کا استعارہ اور ہے

ایک مٹھی ریت میں کیسے تھے
اس سمندر کا کنارہ اور ہے

موج کے مڑنے میں کتنی دیر ہے
ناؤ ڈالی اور دھارا اور ہے

جنگ کا ہتھیار طے کچھ اور تھا
تیر سینے میں اُتارا اور ہے

متن میں تو جُرم ثابت ہے مگر
حاشیہ سارے کا سارا اور ہے

ساتھ تو میرا زمیں دیتی مگر
آسماں کا ہی اشارہ اور ہے

دُھوپ میں دیوار ہی کام آئے گی
تیز بارش کا سہارا اور ہے

ہارنے میں اک اَنا کی بات تھی
جیت جانے میں خسارہ اور ہے

سُکھ کے موسم اُنگلیوں پر گن لیے
فصلِ غم کا گوشوارہ اور ہے

دیر سے پلکیں نہیں جھپکیں مری
پیشِ جاں اب کے نظارہ اور ہے

اور کچھ پل اُس کا رستہ دیکھ لوں
آسماں پر ایک تارہ اور ہے

حد چراغوں کی یہاں سے ختم ہے
آج سے رستہ ہمارا اور ہے

اس کی ثنا میں حدِ بیاں سے نکل چکا
دل کا یہ حال ہے تو یہاں سے نکل چکا

اک حرفِ تلخ میری زباں سے نکل چکا
کیا عذر ہو کہ تیر کماں سے نکل چکا

بانٹی تھی جس نے عام معافی کی خود نوید
وہ راتوں رات شہرِ اماں سے نکل چکا

اب زندگی چراغ بکف آئی بھی تو کیا
اک آدمی تو کون و مکاں سے نکل چکا

آنکھوں نے بھی یہ جان لیا ہے کہ کوئی شخص
اک خواب تھا کہ عرصۂ جاں سے نکل چکا

بچھڑنا سہل ہو گیا ہے بات درمیان میں
خدا کا شکر پڑ رہی تھی رات درمیان میں

عجب بساط ہے کہ جیتنے کا ذکر ہی نہیں
فریق دونوں چاہتے ہیں مات درمیان میں

اشارہ کُوچ کا تو ہو چکا ہے دیر سے مگر
بچھا رکھی ہے زندگی نے گھات درمیان میں

فصیلِ شوق پر کمند ڈالنا تو کچھ نہ تھا
مگر کہ پڑ رہا تھا شہرِ ذات درمیان میں

کُھلا یہ بعدِ گفتگو کہ حاصلِ سخن رہی
وہی جو کٹ رہی تھی ایک بات درمیان میں

ابھی تو سات قحط اور سات بارشیں بھی ہیں
یہ کون مانگنے لگا نجات درمیان میں

بادباں کھُلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
مَیں سمندر دیکھتی ہُوں تم کنارہ دیکھنا

یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مُڑ کر دوبارہ دیکھنا

کس شباہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند
اے شبِ ہجراں! ذرا اپنا ستارہ دیکھنا

کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر پسپا ہُوئے
ان ہی لوگوں کو مقابل میں صف آرا دیکھنا

جب بنامِ دل گواہی سر کی مانگی جائے گی
خون میں ڈوبا ہوا پرچم ہمارا دیکھنا

جیتنے میں بھی جہاں جی کا زیاں پہلے سے ہے
ایسی بازی ہارنے میں کیا خسارہ دیکھنا

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمہارا دیکھنا

ایک مُشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

کیسا ثبات ہے کہ روانی بھی ساتھ ہے
واپس ہیں اور ناؤ میں پانی بھی ساتھ ہے

آسیب کون سا ہے تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں، نقلِ مکانی بھی ساتھ ہے

یونہی نہیں بہار کا جھونکا بھلا لگا
تازہ ہوا کے، یاد پُرانی بھی ساتھ ہے

ہر قصّہ گو نے دیدۂ بےخواب سے کہا
اِک نیند لانے والی کہانی بھی ساتھ ہے

ہجرت کا اعتبار کہاں ہو سکے کہ جب
چھوڑی ہُوئی جگہ کی نشانی بھی ساتھ ہے

لیڈی آف دی ہاؤس

سبز ریشمی پردے
اور زرد غالیچہ
کارنس کے اوپر
صادقین کی تصویر
مغربی دریچے سے
ال ذرا قریب ہو کر
قیمتی پیانو ہے
پھول دان اس جانب
میری جان اُس جانب

بچے سو چکے ہیں کیا؟
تم بھی تھوڑا دم لے لو
پھر یہ کام کر لینا
خوب یاد آ گیا
شام سے ذرا پہلے
کچھ سنگھار کر لینا

میرے نرم دل محبوب!
میری خوشنما آنکھیں
جن کے شبنمی آنسو
تیرے مسکراتے لب
چومتے نہیں تھکتے
کیا اگر تری ہوتیں
(تیری ملکیت ہوتیں)
اس قدر حسیں لگتیں
تیرا دل یونہی دکھتا

مجھ پہ کیا ترس کھانا
میرا کوئی آقا ہو
نام میں بھلا کیا ہے
اس کی دی ہُوئی چھت کا
بوجھ مجھ کو ڈھونا تھا
اور عُمر بھر میرا
یونہی صرف ہونا تھا

DEMONETIZATION

قدروں کے نمبر منسوخ ہوُئے
شہر میں کچھ ایسی ٹکسالیں پائی گئی تھیں
جن میں سچ کا چہرہ جھوٹ سے بڑھ کر روشن ڈھلتا تھا
سکوں کی نیت میں کھوٹ بہت کم ہونے لگا تھا
وقت کی اصل شناس دہکتی بھٹّی میں
سونے اور پیتل کی پرکھ اب تک ممکن تھی!

بازاروں میں لیکن جیسی گرانی تھی

اس عالم میں
افراطِ خواہش، تفریطِ وقت کے ساتھ
نقدِ جاں کی ارزانی ہی ممکن تھی!
درہمِ خودداری، دینارِ عزّتِ نفس
کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلے
سامانِ آسائش سے آراستہ دوکانوں کے آگے
پھیلے ہُوئے ہاتھوں کی بھیڑ لگی ہے
اور پھیلی ہوئی ہتھیلی کا مذہب ہی کیا؟

اچھا ہُوا
جو ایسی ٹکسالوں پہ چھاپے مارے گئے
اور سچائی، نیکی اور عفو اور خودداری کا خزانہ
بحقِ کذب زمانہ ضبط ہُوا

خلقِ خُدا نے سُکھ کا سانس لیا ہے
اب ہر شخص قریبی مذبح خانے سے
اپنے اپنے حافظے کی خودکار تجوری میں رکھی
ان منسُوخ شدہ قدروں کے بدلے
جو جی چاہے لے سکتا ہے
چھُری، کلہاڑی یا رسّی!

ٹکٹکی

کیا وہ شہر میں داخل ہونے والا پہلا شخص تھا
یا اس بستی کے آدابِ مسافر داری ہی ایسے ہیں
ابھی تو اس نے کسی شجر کی جانب بھی کم ہی دیکھا تھا
شہر پناہ پہ استادہ پہرے داروں میں
آج کا لفظِ رہداری کیا طے پایا تھا
جس کے لیے
سچ کی پہچان اتنی مشکل تھی!

شاہِ وقت نے ایسا کون سا خواب بھلا دیکھا تھا

جس پر
خوف کی بوڑھی کاہنہ نے
راتوں رات پیمائشِ عرضِ گلو کی منادی کر دی ہے
شہر کے بیچوں بیچ
صلیبِ خوں آشام گڑی ہے
اور اناڑی ہاتھوں سے بننے والا اک حلقہ
اپنے نصف قطر تک کھنچنے والا ہے
اک جھٹکا
اور خوابِ نحس کا صدقہ اُتار لیا جائے گا
لیکن — اک پل
کوئی مشیرِ باتدبیر
اپنے مقدس آقا کو یہ بھی تو دکھائے
چشمِ عالم کو کیسی ٹکٹکی لگی ہے !

روزِ سیاہ

کیا سُورج نکلا ہے؟
ہر آتے جاتے سے
میرا آج یہی سوال رہا ہے
جانے میرے سوال میں کیا آسیب نظر آتا ہے
کہ ہر رہگیر
نہایت تیز تیز قدموں سے گلی سے دُور نکل جاتا ہے
یا پھر
اُلٹے پاؤں وہیں واپس ہو جاتا ہے
جس کوُچے میں شہر کے سب مشہور کفن گر رہتے ہیں

مَیں نے اپنے ظاہر اور باطن کی سب آنکھوں کو مل کر
دیکھ لیا ہے
روشنی کی ننھّی سی کرِن بھی
مجھے سجھائی نہیں دیتی
کیا اس عُمر میں آ کر مجھ کو سُورج مکھی ہُوا ہے
یا میرے وجدان کا کہنا سچ ہے
کہ سُورج قتل ہُوا ہے!

اُونٹ کا حافظہ رکھنے والے

میرا قبیلہ بڑا عجب ہے
اپنا نسب صحرا گردوں سے ملاتا ہے
اپنے خیمے ریگ رواں پہ لگاتا ہے
رزق اپنا سانپوں سے چھین کے لاتا ہے
موت کے ڈر سے چھوٹنے والوں کی نفرت میں
ایک ہزار رطل انسانوں کے بدلے
ایک اُونٹ سے پیار زیادہ ہے
صدیوں کی ہمراہی نے
راکب و مرکب میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر دی

دونوں مزاجوں کے مابین
کوئی خطِ تفریق نہیں کھنچ سکتا ہے
تیز روی کے ساتھ غلاموں جیسا تحمّل مرکب میں
اور راکب کی پشت پہ اک کوہان
(بظاہر نظر نہ آنے والا)
رزق اندوزی اور اطاعت کے ہمراہ
ہر عورت اپنے مُردہ وارث کی آنکھوں کی پُتلی میں
جمی ہُوئی تصویر کو ڈھونڈنا جانتی ہے
اور موقعہ پاکر ہر مرد
اپنے تیز مزاج مربّی کی ہڈیاں چبا سکتا ہے
میرے قبیلے کی بولی میں
لفظِ عفو نہیں ہوتا!

بارشوں کی کچھ نظمیں

(۱)

نوید کوئی بنامِ موسم
نہ تہنیت کوئی چشمِ نم کو
نہ مسکرانے کا تھا سبب کچھ
مگر ملے تو
خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی
ہم اپنی آواز سن کے حیران ہو رہے تھے
ہمارے لہجے میں
رات بھر ہونے والی بارش کھنک رہی تھی!

(۲)

پیروں کی مہندی میں نے
کس مشکل سے چھڑائی تھی
اور پھر پیرہن خوشبو کی
کیسی کیسی بنتی کی تھی

پیاری دھیرے بول
گھر جاگ اٹھے گا
لیکن جب اس کے آنے کی گھڑی ہوئی
صبح سے ایسی جھڑی لگی
عمر میں پہلی بار مجھے
بارش اچھی نہیں لگی!

(۳)

بارش اب سے پہلے بھی کتنی بار ہوئی تھی
کیا اس بار مرے رنگریز نے چنری کچی رنگی تھی
یا تن کا ہی کہنا سچ کہ
رنگ تو اس کے ہونٹوں میں تھا!

(۴)

بارش میں کیا تنہا بھیگنا لڑکی !
اسے بُلا جس کی چاہت میں
تیرا تن من بھیگا ہے
پیار کی بارش سے بڑھ کر کیا بارش ہو گی
اور جب اس بارش کے بعد
ہجر کی پہلی دھوپ کھلے گی
تجھ پہ رنگ کے اسم کُھلیں گے

ایک اُداس نظم

ایک طرف سہاگ ہے
اور دوسری طرف
رُوح کو جلانے والی آگ ہے
خود پہ برف گرتے دیکھتی رہوں
کہ روشنی کا ہاتھ تھام لُوں
اے خدائے آب و نار
میرا فیصلہ سُنا
زندہ دفن ہوں
کہ زندگی کا ہاتھ تھام لُوں؟

ایک معقول نکاح

ایک روز بہرام بادشاہ نے ایک اُلّو کی آواز سُنی تو موبذان حکیم سے پوچھنے لگا، کیا سمجھتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جی ہاں، ایک نر بوم کسی مادہ بوم سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے مہر میں بیس ویران گاؤں کا مطالبہ کرتی ہے۔ نر بوم اس شرط کو قبول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر بہرام بادشاہ کی حکومت کچھ دن اور رہ گئی تو تو بیس ویران گاؤں کا مطالبہ کرتی ہے میں تجھ کو ہزار ویران گاؤں دوں گا۔

(مسعودی)

تو فی الوقت مہرِ مؤجل ہی کافی ہے
فکرِ معجّل تو تب ہو
کہ مطلوبہ ویرانیاں مُشتبہ ہوں
یہاں تو مکانات کچھ ایسی سرعت سے کھنڈرات میں ڈھل رہے ہیں
کہ ہم سات پُشتوں تک اپنے بسیرے کی فکروں سے آزاد ہو جائیں گے
اب نہ کھیتوں میں فصلوں کی ہے بدشگونی
نہ آنگن میں گڑیا لیے کوئی بچّی

نہ پنگھٹ پہ گاگر چھلکنے کی ناخوشگواری
نہ چوپال پر بے تکی گفتگو
گِدھوں کا نمایندہ پہلے ہی مجھ کو کسی جشن کا کارڈ پہنچا گیا ہے
جہاں بعدِ اکل و شرب
غیرِ معلوم مدت تلک
محفلِ رقص برپا رہے گی
سُنا ہے کہ چمگادڑوں کا بھی اپنا الگ طائفہ زیرِ ترتیب ہے
کہ جس کو ولایت گہِ مرگ میں
فتح کا گیت گانے کا اعزاز بخشا گیا ہے
تباہی کے قاصد مری جاں مرے سبز پا
خُداوندِ ابلیس تیرے ارادوں میں برکت کرے
کتابِ نحوست سے نکلی ہوئی تیری بدفال کو
حافظِ خوش دہن کی طرح وصفِ تکمیل دے
دیہہ موعودہ کی ممکنہ دسترس دیکھ کر
نان و نفقہ کی مجھ کو بھلا فکر کیا

غم کا موضع
اداسی کی تحصیل
تنہائی کا پرگنہ
مری عُمر بھر کی کفالت کو کافی رہیں گے
شُنے بُوم نہ صاحب بارگاہِ حماقت
قاضیِ شاہ بہرام کو حُکم ہو
صیغۂ عقد پڑھ دے!

آتشِ جاں سے قفس آپ ہی جل جانا تھا
قفلِ زنداں! ترا مقسُوم پگھل جانا تھا

جس کو اک نسل نے سینچا تھا لہُو سے اپنے
اک نہ اک روز تو اس پیڑ کو پھل جانا تھا

وقت سے پہلے کبھی شام نہ یوں آ لیتی
مُنہ اندھیرے ہی ہمیں گھر سے نکل جانا تھا

ہارنے والوں سے سمجھوتا کہاں ممکن تھا
حرف ملتے بھی تو مفہُوم بدل جانا تھا

کس کو ٹھہرائیں گے میثاقِ محبت میں فریق
ہم نے خود کو بھی ارادے کا اٹل جانا تھا

اس نے ہی پہلی ہواؤں میں مرا دامن تھاما
جس دیے کو کسی نیکی کا بدل جانا تھا

وقت کی اتنی کمیں گاہوں سے ہو آئی ہے
زندگی! اب تو کسی طور سنبھل جانا تھا

وہ تو کہیے کہ کھلی آنکھ رکھی نیند میں بھی
ورنہ ہر شب کا کوئی وار تو چل جانا تھا

فصل بر وقت نہ کٹتی جو سروں کی پروین
آسمانوں نے زمینوں کو نگل جانا تھا

کسے خبر ہے کہ کیا رنج و غم اُٹھاتے ہیں
تراش کر جو زباں کو قلم اُٹھاتے ہیں

قرارِ دادِ محبّت تو کب کی فسخ ہوئی
فریق آج یہ کیسی قسم اُٹھاتے ہیں

زمیں کی پُشت تحمّل سے دوہری ہو جائے
اگر وہ بوجھ اُٹھائے جو ہم اُٹھاتے ہیں

مثالِ دُردِ تہِ جام ہیں کہ بیٹھ کے بھی
اک اور حشر پسِ جامِ جم اُٹھاتے ہیں

ہمیں بُجھانے کو اندر کا حبس کافی ہے
ہَوا مزاجوں کا احسان کم اُٹھاتے ہیں

وہاں بھی ہم تو ستارہ سوار تھے کہ جہاں
بہت ہی سوچ سمجھ کے قدم اُٹھاتے ہیں

گواہی کیسے ٹوٹتی، معاملہ خُدا کا تھا
مرا اور اس کا رابطہ تو ہاتھ اور دُعا کا تھا

گلاب قیمتِ شگفت شام تک چکا سکے
ادا وہ دُھوپ کو ہُوا جو قرض بھی صبا کا تھا

بکھر گیا ہے پھُول تو ہمیں سے پُوچھ گچھ ہوئی
حساب باغباں سے ہے کیا دھرا ہوا کا تھا

لہُو چشیدہ ہاتھ اس نے چُوم کر دکھا دیا
جزا وہاں ملی جہاں کہ مرحلہ سزا کا تھا

جو بارشوں سے قبل اپنا رزق گھر میں بھر چکا
وہ شہرِ مور سے نہ تھا، پہ دُور بیں بلا کا تھا

کُتوں کا سپاسنامہ

رنگ تو آپ کے ہاتھ میں جا کے یوں بول اُٹھتے ہیں
جیسے ازل سے اسی دستِ معجز اثر کے لیے منتظر تھے
تصاویر میں کس قدر کا تنوّع ہے
لینڈ اسکیپ میں فارم اور خط کا کا تھک توازن
ادھر منجمد زندگی میں حرارت کی اور رنگ کی یہ فلیمش فضا

بی بی!
آپ ان کی باتوں میں مت آیئے
دیکھیے تو کہ اس نقش میں
دُور ہوتے ہُوئے سُرمئی رنگ کے یہ پہاڑ

جان ایک کے بنائے ہُوئے فاصلے کے اصُولوں سے کیسے
ہم آہنگ ہیں

اور یہ پورٹریٹس
رافیل اور ٹشن ایسے کچھ سوچ سکتے بھلا؟
ہمیں تو یہاں مائیکل انجلو اور ڈونچی کے اسٹروک یاد آ گئے!
او ہو، مشرقی سمت میں بھی تو دیکھیں ذرا
راہ تکتی ہوئی یہ حسینہ
اگر ریمبراں دیکھ لیتا
تو پھر نیم وا در میں نوعمر لڑکی بنانے کی جرأت نہ کرتا
ذرا روشنی کا تناسب تو دیکھیں
یہاں آپ نے نیم فاقہ زدہ گاؤں کا رُخ کیا
تو مجھے
ڈومیا کے تخیّل سے نکھری ہوئی درجۂ سوم کی اک سواری
بہت یاد آنے لگی

اور یہ — صبح کے وقت اک شہر کا نیم بیدار منظر
کہ جیسے دھڑکتا رہا ہو یہاں برش وان تاگ کا
گیلری ختم ہونے سے پہلے وہاں تیضوی موڑ پہ

کیو بزم کے عجب شاہ پارے بجے ہیں
پکاسو کے ہاتھوں کا سارا ہنر آپ کا تجربہ بن گیا!
اتنے بھرپور اور جاں فزا تبصروں کے لیے
آپ سب کی تہ دل سے ممنون ہوں
مگر قبل اس کے
کہ مجھ مبتدی کے لیے
داد و تحسیں کے ٹکراؤ میں
آپ کے سر پھٹیں
ناقدینِ کرام!
اپنی باچھوں سے بہتی ہوئی
رال تو پونچھ لیں!

پوسٹ ڈنر آئیٹم

آپ کی زُلف کے ہم تو پہلے ہی گویا اسیروں میں تھے
آج تو آپ کے ہاتھ بھی چوم لینے کو جی چاہتا ہے
کہ آج آپ نے
اتنی انواع و اقسام کی لذتیں میز پر جمع کر دیں
کہ ہم لوگ حیران تھے سب
کہاں سے شروعات ہوں
تعجب تو یہ ہے کہ اپنے سماجی فرائض میں اس درجہ
مصروف رہنے کے باوصف
آپ اتنے گھنٹے کچن میں رہیں

نوکروں کا قحط اور پھر خاص کر ٹکس کی بد دماغی کے
عالم میں
اتنا بہت کچھ! پھر اتنا مزیدار کھانا پکانا!
ہمیں تو کوئی معجزہ ہی لگا
اس پہ حیران کن بات یہ ہے
کہ اتنی تھکن پہ
جبیں اور ساری پہ کوئی شکن تک نہیں
اس ڈنر کے مقابل میں بیگم فلاں کا ڈنر کچھ نہ تھا!

شکریہ

اس پسندیدگی کا بہت شکریہ
اب یہ فرمائیں، کیا پیش ہو
چائے، کافی کہ شاعر؟

بُجھ گئی آنکھ تو پیراہنِ تر کیا لائے
چاہ سے اب مرے یُوسف کی خبر کیا لائے

جب مسافر کا ارادہ ہی بھٹکنے کا ہُوا
اک چراغ اور سرِ راہگزر کیا لائے

رات ہم خانہ خرابوں کا بھرم رکھ لیتی
روشنی رستے میں مہمان کو گھر کیا لائے

شب گزارو! وہ ستارہ تو مرا ڈوب چکا
اب دمِ صُبح دُعاؤں میں اثر کیا لائے

اک دیا بجھ ہی گیا ہوگا سرِ طاقِ اُمید
ورنہ پیغام ہواؤں کو ادھر کیا لانا

شہر میں سانپ جب انسانوں سے نومید ہو جائیں
پیشِ آئینہ کوئی ذہن میں ڈر کیا لانا

اتنی مہلت ہے کہ میں مشک میں پانی بھر لوں؟
فاصلہ کم ہو تو پھر زادِ سفر کیا لانا!

شاخِ بدن کو تازہ پھُول نشانی دے
کوئی تو ہو جو مری جڑوں کو پانی دے

اپنے سارے منظر مجھ سے لے لے ـــ اور
مالک ! میری آنکھوں کو حیرانی دے

اس کی سرگوشی میں بھیگتی جائے رات
قطرہ قطرہ تن کو نئی کہانی دے

اس کے نام پہ کھُلے دریچے کے نیچے
کیسی پیاری خوشبو رات کی رانی دے

بات تو تب ہے میرے حرف گواہی دیں ان کے ساتھ
کوئی اُس لہجے کو بات پُرانی دے

ایک سُورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اُٹھا
آنکھ حیران ہے، کیا شخص زمانے سے اُٹھا

کس سے پوچھوں ترے آقا کا پتہ اے رہوار
یہ عَلم وہ ہے نہ اب تک کسی شانے سے اُٹھا

حلقۂ خواب کو ہی گردِ گُلو کَس ڈالا
دستِ قاتل کا بھی احساں نہ دوانے سے اُٹھا

پھر کوئی عکس شعاعوں سے نہ بننے پایا
کیسا مہتاب مرے آئینہ خانے سے اٹھا

کیا لکھا تھا سرِ محضر، جسے پہچانتے ہی
پاس بیٹھا ہُوا ہر دوست بہانے سے اُٹھا

آج تک شہر کا چہرہ نہیں دُھلنے پایا
گرد کا کیسا بگولا ترے جانے سے اُٹھا

زندگی ہیں یہ بدن شعلۂ جوّالہ تھا
موجۂ سرد! مری راکھ ٹھکانے سے اُٹھا

ڈھال اب وقت کے ہاتھوں میں ہے اے تیر انداز
رکھ دے اک سمت کماں ہاتھ نشانے سے اُٹھا

دل تری چشم مدارات سے بیعت تھا تو پھر
کس طرح بزم میں اوروں کے اُٹھانے سے اُٹھا

دودِ یک سینۂ سوزاں سے بھلا کیا ڈرنا
وہ دُھواں دیکھ جو شعلوں کے بجھانے سے اُٹھا

دل دُکھا ہے تو کھلی ہے مرے وجدان کی آنکھ
اک شگوفہ تھا کہ شبنم کے جگانے سے اُٹھا

سونپ دے اپنا ہُنر ان کو کہ جن کا حق ہے
وقت آیا ہے کہ اب سانپ خزانے سے اُٹھا

کتبہ

یہاں پہ وہ لڑکی سو رہی ہے
کہ جس کی آنکھوں نے نیند سے خواب مول لے کر
وصال کی عمر رتجگے میں گزار دی تھی
عجیب تھا انتظار اس کا
کہ جس نے تقدیر کے تنک حوصلہ مہاجن کے ہاتھ
بس اک دریچۂ نیم باز کے سُکھ پہ
شہر کا شہر رہن کروا دیا تھا
لیکن وہ ایک تارہ

کہ جس کی کرنوں کے مان پر
چاند سے حریفانہ کشمکش تھی
جب اُس کے ماتھے پہ کھلنے والا ہُوا
تو اُس پل
سپیدۂ صبُح بھی نمودار ہو چکا تھا
فراق کا لمحہ آ چکا تھا!

خود کلامی

پروین شاکر

مــراد
تیرے نام!

ترتیب

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی

بات وہ آدھی رات کی، رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا، اُس پہ ترا جمال بھی

سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو کچھ ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رُک گئی گردشِ ماہ و سال بھی

دل تو چمک سکے گا کیا، پھر بھی ترش کے دیکھ لیں
شیشہ گرانِ شہر کے ہاتھ کا یہ کمال بھی

اُس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھیے، بات تھی کچھ محال بھی

میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا، بھول گیا سوال بھی

اُس کی سخن طرازیاں میرے لئے بھی ڈھال تھیں
اُس کی ہنسی میں چھپ گیا اپنے غموں کا حال بھی

گاہ قریبِ شاہ رگ، گاہ بعیدِ وہم و خواب
اُس کی رفاقتوں میں رات، ہجر بھی تھا وصال بھی

اُس کے ہی بازوؤں میں اور اُس کو ہی سوچتے رہے
جسم کی خواہشوں پہ تھے رُوح کے اور جال بھی

شام کی نا سمجھ ہوا پوچھ رہی ہے اِک پتا
موجِ ہوائے کوئے یار، کچھ تو مرا خیال بھی

دو (۲) ساحلی نظمیں

(۱)

پہلے چاند کی نرم مہکتی رات
سبک ساحل کی ٹھنڈک
اور خوش لمس ہوا
تن کی چاہ میں جلنے والی
دو پیاسی روحوں کو ایسے چھونے لگی تھی
جیسے اُن کا دُکھ پہچان گئی ہو !

(۲)

جس جذبے پر
دن بھر سورج اپنے ہاتھ رکھے رہتا تھا
شب کے لمس سے ایسے جاگ پڑا تھا
ریت کی دلآرام رفاقت
اور سُلگتی تنہائی کے بیچ
سمندر کی باہوں سے لپٹے ہوئے دو منکر جسم
اپنے آپ سے ہار چکے تھے
رات کا جادو جیت چکا تھا!

آلامِ حیات۔ لوٹ آئیں
آسائشیں مجھ کو کھا نہ جائیں

کیا ایسی تلاشِ آب و دانہ
پرواز کا لطف بھول جائیں

تو مقتلِ شب سے آ رہی ہے
اے صبح! تجھے گلے لگائیں

آسان سہی بچھڑ کے رہنا
پر اُس کا سا دل کہاں سے لائیں

جب ہم کسی اور کا لُوٹے رزق
کِس کے لیے زندگی کمائیں

معلوم، کہ چھوڑنا ہے اِک دن
پھر بھی یہ لگن کہ گھر بنائیں

بستی میں اُتر رہا ہے پانی
ہم اور کہاں اُتر کے جائیں

پانی ہے، ہوا ہے یا خلا ہے
ہم اپنے قدم کہاں جمائیں

یوں حوصلہ دل نے ہارا کب تھا
سرطان مرا ستارا کب تھا

لازم تھا گزرنا زندگی سے
بن زہر پیئے گزارا کب تھا

کچھ پل اُسے اور دیکھ سکتے
اشکوں کو مگر گوارا کب تھا

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اُس کا ہی قصور سارا کب تھا

اب اور کے ساتھ ہے تو کیا دُکھ
پہلے بھی کوئی ہمارا کب تھا

اک نام پہ زخم کِھل اُٹھے تھے
قاتل کی طرف اشارا کب تھا

آئے ہو تو روشنی ہُوئی ہے
اِس بام پہ کوئی تارا کب تھا

دیکھا ہوا گھر تھا پر کسی نے
دُلہن کی طرح سنوارا کب تھا

کھُلے گی اُس نظر پہ چشمِ تر آہستہ آہستہ
کیا جاتا ہے پانی میں سفر آہستہ آہستہ

کوئی زنجیر پھر واپس وہیں پر لے کے آتی ہے
کٹھن ہو راہ تو چھُٹتا ہے گھر آہستہ آہستہ

بدل دینا ہے رستہ یا کہیں پر بیٹھ جانا ہے
کہ تھکتا جا رہا ہے ہم سفر آہستہ آہستہ

خلش کے ساتھ اِس دل سے نہ میری جاں نکل جائے
کھنچے تیرِ شناسائی مگر آہستہ آہستہ

ہَوا سے سرکشی میں پھول کا اپنا زیاں دیکھا
سو جُھکتا جا رہا ہے اب یہ سر آہستہ آہستہ

جواز

کتنی سنسان زندگی تھی
سب طاق مرے دیے سے خالی
بے برگ و ثمر بدن کی ڈالی
کھڑکی پہ نہ آ کے بیٹھے چڑیا
آنگن میں بھٹک سکے نہ تتلی
سنجوگ کی بے نمو رتوں سے
میں کتنی اُداس ہو چلی تھی

آواز کے سیلِ بے پنہ میں
میں تھی، مرے گھر کی خامشی تھی

پر دیکھ تو آ کے لال میرے
اس کلبۂ غم میں مجھ کو تیرے
آنے کی نوید کیا ملی ہے
جینے کا جواز مل گیا ہے!

میرا لال

میرے زرد آنگن میں
سرخ پھول کی خوشبو
نقرئی کرن بن کر
کاسنی دنوں کی یاد
سبز کرتی جاتی ہے!

تیری موہنی صُورت

ہاں مجھے نہیں پروا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
سب اُداس رستوں پر
ایک چاند روشن ہے
تیری موہنی صورت!

کائنات کے خالق!

کائنات کے خالق:
دیکھ تو مرا چہرہ
آج میرے ہونٹوں پر
کیسی مسکراہٹ ہے
آج میری آنکھوں میں
کیسی جگمگاہٹ ہے
میری مسکراہٹ سے
تجھ کو یاد کیا آیا

میری بھیگی آنکھوں میں
تجھ کو کچھ نظر آیا
اس حسین لمحے کو
تُو تو جانتا ہو گا
اس سمے کی عظمت کو
تُو تو مانتا ہو گا

ہاں — ترا گماں سچ ہے
ہاں — کہ آج میں نے بھی
زندگی جنم دی ہے!

اب بھلا چھوڑ کے گھر کیا کرتے
شام کے وقت سفر کیا کرتے

تیری مصروفیتیں جانتے ہیں
اپنے آنے کی خبر کیا کرتے

جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرتے

وہ مسافر ہی کھُلی دھوپ کا تھا
سائے پھیلا کے شجر کیا کرتے

خاک ہی اوّل و آخر ٹھہری
کر کے ذرّے کو گہر کیا کرتے

رائے پہلے سے بنا لی تُو نے
دل میں اب ہم ترے گھر کیا کرتے

عشق نے سارے سلیقے بخشے
حسن سے کسبِ ہنر کیا کرتے

ہم سفر چھوٹ گئے راہگزر کے ہمراہ
کوئی منظر نہ چلا دیدۂ تر کے ہمراہ

ایسا لگتا ہے کہ پیروں سے لپٹ آئی ہے
ایک زنجیر بھی اسبابِ سفر کے ہمراہ

اتنا مشکل تو نہ تھا میرا پلٹنا لیکن
یاد آجاتے ہیں رستے بھی تو گھر کے ہمراہ

کس سے تصدیق کروں شہر کی بربادی کی
اب تو قاصد بھی نہیں ہوتے خبر کے ہمراہ

ہم نے جنگل میں بھی پیچھے نہیں مُڑ کر دیکھا
کیا عجب عزم بندھا رختِ سفر کے ہمراہ

اک نہ اک روز تو رُخصت کرتا
مجھ سے کتنی ہی محبّت کرتا

سب رُتیں آ کے چلی جاتی ہیں
موسمِ غم بھی تو ہجرت کرتا

بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

میرے لہجے میں غرور آیا تھا
اس کو حق تھا کہ شکایت کرتا

کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
اس طرح ترکِ رفاقت کرتا

اور اُس سے نہ رہی کوئی طلب
بس مرے پیار کی عزت کرتا

کسے خبر تھی

(سرُور بارہ بنکوی کے لئے ایک نظم)

وہ زرد موسم کی آخری شب
ہجومِ ہم خوابگاں میں بیٹھا
بہار کے پہلے پھول کا ذکر کر رہا تھا
اور اپنے کل کے لئے سنہری شگون لینے کو
اس کے کِھلنے کا منتظر تھا

کسے خبر تھی
کہ اب کے موسم
بہار کے پہلے پھول کو بھی
شگفت کے معجزے کی خاطر
اُسی کی مٹی کا آسرا تھا!

مسفٹ[1]

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں
مجھ میں لوگوں کو خوش رکھنے کا ملکہ
اتنا کم کیوں ہے
کچھ لفظوں سے کچھ میرے لہجے سے خفا ہیں
پہلے میری ماں
میری مصروفیت سے
نالاں رہتی تھی
اب یہی گِلہ مجھ سے میرے بیٹے کو ہے !
(رزق کی اندھی دوڑ میں رشتے کتنے پیچھے رہ جاتے ہیں)

[1] MISFIT

جب کہ صورتِ حال تو یہ ہے
میرا گھر
میرے عورت ہونے کی مجبوری کا
پورا لطف اٹھاتا ہے
ہر صبح
میرے شانوں پر
ذمہ داری کا بوجھ لیکن
پہلے سے بھاری ہوتا ہے
پھر بھی میری پشت پہ
نا اہلی کا کوب
روز بروز نمایاں ہوتا جاتا ہے !

پھر میرا دفتر ہے
جہاں تقرر کی پہلی ہی شرط کے طور پہ
خود داری کا استعفٰے داخل کرنا تھا

میں بنجر ذہنوں میں پھول اگانے کی کوشش کرتی ہوں
کبھی کبھی ہریالی دکھ جاتی ہے
ورنہ
پتھر
بارش سے اکثر ناراض ہی رہتے ہیں
مراقبیلہ
میرے حرف میں روشنی ڈھونڈ نکالتا ہے
لیکن مجھ کو
اچھی طرح معلوم ہے
ان میں
کس کی نظریں لفظ پہ ہیں
اور کس کی لفظ کی خالق پر
سارے دائرے میرے پاؤں سے چھوٹے ہیں
لیکن وقت کا وحشی ناچ
کسی مقام نہیں رکتا

رقص کی لے ہر لمحہ تیز ہوئی جاتی ہے
یا تو میں کچھ اور ہُوں
یا پھر
یہ میرا سیّارہ نہیں ہے!

اختیار کی ایک کوشش

اگر بن میں رہنا مقدّر ہے
اور یہ اک طے شدہ امر بھی ہے
کہ ہر بن میں بس بھیڑیے منتظر ہیں مرے
تو یہ سوچتی ہوں
کہ اس صورتِ حال میں
کیوں نہ پھر
اپنی مرضی کے جنگل میں ہی جا بسوں!

نئے سال کی پہلی نظم

اندیشوں کے دروازوں پر
کوئی نشان لگاتا ہے
اور راتوں رات تمام گھروں پر
وہی سیاہی پھر جاتی ہے

دُکھ کا شب خوں روز ادھورا رہ جاتا ہے
اور شناخت کا لمحہ بیتتا جاتا ہے

میں اور میرا شہرِ محبّت
تاریکی کی چادر اوڑھے
روشنی کی آہٹ پر کان لگائے کب سے بیٹھے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں کو سُنتے رہتے ہیں !
حدِ سماعت سے آگے جانے والی آوازوں کے ریشم سے
اپنی ردائے سیاہ پہ تارے کاڑھتے رہتے ہیں
انگشتانے اِک اِک کر کے چھلنی ہونے کو آئے
اب باری انگشتِ شہادت کی آنے والی ہے
صبح سے پہلے وہ کٹنے سے بچ جائے — تو !

وقت کے ساتھ عناصر بھی رہے سازش میں
جل گئے پیڑ کبھی دھوپ کبھی بارش میں

وہ تو اک سادہ و کم شوق کا طالب نکلا
ہم نے ناحق ہی گنوایا اُسے آرائش میں

زندگی کی کوئی محرومی نہیں یاد آئی
جب تلک ہم تھے ترے قرب کی آسائش میں

ایک دُنیا کا قصیدہ تھا اگرچہ مرے نام
لطف آتا تھا کسی شخص کی فہمائش میں

اس کی آنکھیں بھی مری طرح سے گروی ہیں ابھی
خواب کا قرض بڑھا جاتا ہے اِک خواہش میں

الزام تھا دیے پہ نہ تقصیر رات کی
ہم نے تو بس ہوا کے تعلق سے بات کی

ہر صبح جب کہ صبحِ قیامت کی طرح آئے
ایسے میں کون ہو گا جو سوچے ثبات کی

تکلیف تو ہوئی مگر اے ناخنِ ملال
کھلنے لگی گرہ بھی کوئی اپنی ذات کی

زنجیر ہے جزیرہ ہے یا شاخِ بے ثمر
اب کون سی لکیر سلامت ہے ہات کی

مرنے اگر نہ پائی تو زندہ بھی کب رہی
تنہا کٹی وہ عمر جو تھی تیرے سات کی

پھر بھی نہ میرا قافلہ لٹنے سے بچ سکا
میں نے خبر تو رکھی تھی ایک ایک گھات کی

اک لمحہ تو پتھر بھی خوں رو جائے
جب خوابوں کا سونا مٹی ہو جائے

اک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل اور سارے دریچے دھو جائے

پہرہ دیتے رہتے ہیں جب تک خدشے
کیسے رات کے ساتھ کوئی پھر سو جائے

بارش اور نمو تو اس کے ہاتھ میں ہیں
مٹی میں پر بیج تو کوئی بو جائے

تین رُتوں تک ماں جس کا رستہ دیکھے
وہ بچہ چوتھے موسم میں کھو جائے

وہ

اِک لمبے سفر کی دھوپ سر پہ
آنکھوں میں گلابی رتجگوں کی
ملبوس پہ گرد راستوں کی
شانوں پہ تھکن مسافتوں کی
آواز میں جھیل جیسا ٹھہراؤ
سینے میں چھپائے زخمِ خنداں
میلے میں خود اپنے سے بچھڑ کے
دامن مرا تھام کر کھڑا ہے
بچے کی طرح ملول و مسرور!

ساتھ

کتنی دیر تک
املتاس کے پیڑ کے نیچے
بیٹھ کے ہم نے باتیں کیں
کچھ یاد نہیں
بس اتنا اندازہ ہے
چاند ہماری پشت سے ہو کر
آنکھوں تک آ پہنچا تھا !

اُس کی آواز

کتنی شفّاف ہے یہ آواز
چشمے کی طرح سے جس نے میرے
اندر کے تمام موسموں کو
آئینہ بنا کے رکھ دیا ہے

پتھر ہو کہ پھول ہو کہ سبزہ
تاروں کی برات ہو کہ مہتاب

سورج کا جلال ہو کہ تن میں
خوابوں کی دھنک کھنچی ہوئی ہو
بارش ہو، شفق کھلی ہوئی ہو
ہر رُت کا گواہ اُس کا لہجہ
تہہ تک جسے آنکھ چھو کے آئے
کتنی شفاف ہے یہ آواز!

سرشاری

ہاں، یہ وہ موسم تو وہ ہے
کہ جس میں نظر چُپ رہے
اور بدن بات کرتا رہے
اُس کے ہاتھوں کے شبنم پیالوں میں
چہرہ مرا
پھول کی طرح ہلکورے لیتا رہے
پنکھڑی پنکھڑی

اُس کے بوسوں کی بارش میں
پیہم نکھرتی رہے
زندگی اس جنوں خیز بارش کے شانوں پہ سر کو رکھے
رقص کرتی رہے!

آتش بجاں

آگ باقی عناصر پہ ایسی حاوی ہے
کہ جیسے بدن میں
لہو کی جگہ
کوئی سیّال آتش رواں ہے
ایک تن دوسرے تن کی خواہش میں
صدیوں سے طے یافتہ کیمیا
بھولتا جا رہا ہے
ایک خواہش ہے جس کے تپاں چاک پر

گھومتا جا رہا ہے
ایک شعلہ
کہ مٹی، ہوا اور پانی کی حد چاٹتا جا رہا ہے
زندگی جیسے اب صرف اِک نام ہے
جس پہ دل
جھومتا جا رہا ہے!

بے بسی کی ایک نظم

کیا اُس پہ میرا بس ہے
وہ پیڑ گھنا
لیکن کسی اور کے آنگن کا
کیا پھُول مرے
کیا پھل میرے
سایہ تک چھُونے سے پہلے
دنیا کی ہر اُنگلی مجھ پر اُٹھ جائے گی
وہ چھت کسی اور کے گھر کی
بارش ہو کہ دھوپ کا موسم

مرے اِک اِک دن کے دوپٹے
آنسو میں رنگے
آہوں میں سُکھائے جائیں گے
تہہ خانۂ غم کے اندر

سب جانتی ہوں
لیکن پھر بھی
وہ ہاتھ کسی کے ہاتھ میں جب بھی دیکھتی ہوں
اِک پیڑ کی شاخوں پر
بجلی سی لپکتی ہے
اِک چھوٹے سے گھر کی
چھت بیٹھنے لگتی ہے!

اے رمز بھری رات

جس صبح کی آواز میں بارش کی کھنک ہو
اُس دن کا بدن دیکھئے نُسرکیسے ہُوا ہو
جس شام کے ماتھے پہ کھلے وصل کا تارہ
اُس رات کے اقرار کی کیا صورتیں ہوں گی

اے بھید بھرے دن مرے
اے رمز بھری رات
یہ ماہ زدہ مہر گزیدہ دل وحشی
پھر کون سے جادو کے اثر میں ہے گرفتار
برسات میں جلتے ہُوئے جنگل کے کنارے
کس قاف کے باشندے سے ٹھہری ہے ملاقات!

بے فیض رفاقت میں ثمر کِس کے لئے تھا
جب دھوپ تھی قسمت تو شجر کِس کے لئے تھا

پردیس میں سونا تھا تو چھت کِس لئے ڈالی
باہر ہی نِکلنا تھا تو گھر کِس کے لئے تھا

جس خاک سے پُھوٹا ہے اُسی خاک کی خوشبو
پہچان نہ پایا تو ہُنر کِس کے لئے تھا

اے مادرِ گیتی! تری حیرت بھی بجا ہے
تیرے ہی نہ کام آیا تو سر کِس کے لئے تھا

یُوں شام کی دہشت سے سرِ دشت ارادہ
رُکنا تھا، تو پھر سارا سفر کِس کے لئے تھا

شاید اُس نے مجھ کو تنہا دیکھ لیا ہے
دُکھ نے میرے گھر کا رستا دیکھ لیا ہے

اپنے آپ سے آنکھ چُرائے پھرتی ہُوں میں
آئینے میں کِس کا چہرہ دیکھ لیا ہے

اب بھی سپنے بوئے تو ایمان ہے اُس کا
اُس نے ان آنکھوں میں صحرا دیکھ لیا ہے

اُس نے مجھے دراصل کبھی چاہا ہی نہیں تھا
خود کو دے کر یہ بھی دھوکا، دیکھ لیا ہے

اُس سے ملتے وقت کا رونا کچھ فطری تھا
اُس سے بچھڑ جانے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے

رخصت کرنے کے آداب نبھانے ہی تھے
بند آنکھوں سے اُس کو جاتا دیکھ لیا ہے

کیا کرے میری مسیحائی بھی کرنے والا
زخم ہی یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا

زندگی سے کسی سمجھوتے کے باوصف اب تک
یاد آتا ہے کوئی مارنے مرنے والا

اُس کو بھی ہم ترے کوچے میں گزار آئے ہیں
زندگی میں وہ جو لمحہ تھا سنورنے والا

اُس کا اندازِ سخن سب سے جُدا تھا شاید
بات لگتی ہُوئی، لہجہ وہ مُکرنے والا

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اِک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا

دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کے
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا

اسی اُمّید پہ ہر شام بجھائے ہیں چراغ
ایک تارا ہے سرِ بام اُبھرنے والا

موتی ہار پروئے ہُوئے
دن گزرے ہیں روئے ہُوئے

نیند مسافر کو ہی نہیں
رستے بھی ہیں سوئے ہُوئے

جشنِ بہار میں آ پہنچے
زخم کا چہرہ دھوئے ہُوئے

کبھی نہ کشتِ جاں اُجڑی
خواب تھے ایسے بوئے ہُوئے

اس کو پا کر رہتے ہیں
اپنے آپ میں کھوئے ہُوئے

آج بھی یونہی رکھے رہے
سارے ہار پروئے ہُوئے

کتنی برساتیں گزریں
اُس سے مل کر روئے ہُوئے

ایک وکٹورین شخص سے

بجائے اس کے
کہ تم مجھے سینت سینت کر
اپنے دل میں رکھو
اور الزبتھ دوم کے زمانے میں
عہدِ وکٹوریا کے آداب سیکھنے میں
اسی طرح زندگی گنوا دو ،
اور ایک فقرے کی گفتگو کے لئے
یہاں سے وہاں تلک کا ادب کھنگا لو

بہار کے پہلے دن کا ہر سال،
میری کھڑکی کے نیچے تنہا کھڑے ہُوئے
انتظار کھینچو

بس ایک دن،
دفعتاً
کہیں سے نکل کے آجاؤ
اور مجھے
بازوؤں میں اپنے سمیٹ کر
ایڑیوں پہ تم اپنی گھوم جاؤ !

میں تیتری رہنے میں خوش ہوں

عمر کی نصف شب —
کلبۂ جاں کے گونگے کواڑوں پہ یہ
کوئی دستک ہوئی
یا کہ میں نیند میں ڈر گئی
سوچتی ہوں
یہ کیسی محبت ہوئی
جس کی بنیاد میں خوف کے اتنے پتھر رکھے ہیں
کہ گرنے سے پہلے
عمارت کے سارے دریچوں کے شیشے لرزنے لگے ہیں

ایسا لگتا ہے، یہ خوف
باہر سے بڑھ کے کہیں میرے باطن میں ہے
اُس کی ذہنی وجاہت کی دہشت
اُس کی خوش بوئی کی سانس کو روکنے والی ہیبت
پیچھا کرتی ہُوئی آنکھ سے میری بے پردہ وحشت
تو باطن کے ڈر کا لبادہ ہیں

دراصل میں
اُس کو تسلیم کر کے
عمر بھر کی کمائی
اس آزادئ ذہن و جاں کو
گنوانا نہیں چاہتی

اور مجھے یہ خبر ہے
کہ میں اِک دفعہ
ہاتھ اُس کے اگر لگ گئی تو
وہ مکھی بنا کے مجھے

اپنی دیوارِ خواہش سے تا عمر اس طرح چپکائے رکھے رہے گا

کہ میں

روشنی اور ہوا اور خوشبو کا

ہر ذائقہ اس طرح بھول جاؤں گی

جیسے کبھی ان سے واقف نہ تھی

سو میں تیتری رہنے میں ہی بہت خوش ہوں

گرچہ یہاں

رزق اور جال کی سازشیں بے پنہ ہیں

مگر

میرے پَر تو سلامت رہیں گے !

چین ری ایکشن[1]

مجھے تم اچھے لگتے ہو
تمہاری گفتگو میں
بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کو سمجھنے والے ذہن کی چمک ہے
اور تمہارے لمس میں
وہ گرم تازگی
جو بدن کے سارے موسموں کو سبز رکھتی ہے
تمہارے بازوؤں پہ سر رکھے

[1] CHAIN REACTION

میں ذہن اور جسم کا وصال دیکھتی ہوں
(فی زمانہ کس قدر عجیب واقعہ ہے یہ !)
مگر تمہارے اور میرے درمیاں
زمانوں اور عمروں
اور اپنے اپنے طبقے کے مفاد کا جو بُعد ہے
اُسے پھلانگنا
نہ میرے بس میں ہے
نہ تم میں اس کا حوصلہ !
مفاہمت کی گول میز پہ
کبھی شمال اور جنوب کے مذاکرات کی طرح
ہماری سب دلیلیں
ایک دوسرے پہ شک کریں گی
اور کبھی جنوب اور جنوب کی غلام بحثِ خام کی طرح سے
ایک دوسرے کے خبثِ باطنی کا نیل پرنٹ
ڈھونڈتے رہیں گے ہم !

سو عافیت اسی میں ہے
کہ ہم اندھیرے میں رہیں
اور اپنے اپنے نیوٹرونز سے
تعلقات ٹھیک رکھیں
تمہارے اور میرے آئسوٹوپس
تا بکار نفرتوں کی زد میں ایک بار آ گئے
تو پھر محبتوں کا اختیار ختم سمجھو !

مجبوری کی ایک بات

ہاں اب تم بھی
اپنے سارے وعدوں
اور ٹھنڈک پہنچانے والی باتوں کے ہمراہ
مجھے پیاسا ہی رکھو گے
یہ جذبے میں بھیگی ہوئی آواز
مرے ماتھے کو جتنی بار چھوئے گی
اس کی تپش بڑھ جائے گی
آہستہ آہستہ

میرے تن پر ٹوٹنے اور پھسلنے والی
یہ بارش
یہ آگ
جس کی ٹھنڈک
جس کی حدت
اب بھی تمہاری پوروں میں ہے
میرے شانوں پر سر رکھّے
تم جو یوُں آنکھیں موندے کچھ سوچتے ہو
اس لمحے اس چہرے پر
کیسی سیرابی ۔ کیا آسودگی تیر رہی ہے

میں نادم ہوں
یہ کیفیت
تمہیں مرے لہجے اور میرے چہرے میں
کبھی نظر نہیں آئی

جان!
تمہیں شاید نہ خبر ہو
بعض محبّتیں
اپنے بلڈ گروپ میں
"او منفی" ہوتی ہیں!

الوداعیہ

وہ جا چکا ہے
مگر جُدائی سے قبل کا
ایک نرم لمحہ
ٹھہر گیا ہے
مری ہتھیلی کی پشت پر
زندگی میں
پہلی کا چاند بن کر !

دشت و دریا سے گزرنا ہو کہ گھر میں رہنا
اب تو یہ حال ہیں ہے ہم کو سفر میں رہنا

دل کو ہر پل کسی جادو کے اثر میں رہنا
خود سے نکلے تو کسی اور کے ڈر میں رہنا

شہر غم ! دیکھ تری آب و ہوا خشک نہ ہو
راس آتا ہے اُسے دیدۂ تر میں رہنا

فیصلے سارے اُسی کے ہیں ہماری بابت
اختیار اپنا بس اتنا کہ خبر میں رہنا

کوئی خاطر نہ مدارات نہ تقریبِ وصال
ہم تو بس چاہتے ہیں تیری نظر میں رہنا

رات بھر چاند میں دیکھا کروں صورت اُسکی
صبح کو اور ہی سودا مرے سر میں رہنا

میں تو ہر چہرے میں اب تک وُہی چہرہ دیکھوں
اُس کو ہر روز تماشائے دگر میں رہنا

وہی تنہائی، وہی دُھوپ، وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہُوا، راہگزر میں رہنا

ٹوٹنا یوں تو مقدر ہے، مگر کچھ لمحے
پھول کی طرح میسّر ہو شجر میں رہنا

ہر ملاقات کے بعد اجنبیت اور بڑھی
اُس کو آئینے ہمیں زعمِ ہنر میں رہنا

گھاس کی طرح جہاں بھوک اُگا کرتی ہو
اِتنا آسان نہیں شاخِ ثمر میں رہنا

چاند کی آخری راتوں میں بہت لازم ہے
ایک مٹی کا دیا راہگزر میں رہنا

طائرِ جاں کے گزرنے سے بڑا سانحہ ہے
شوقِ پرواز کا ٹوٹے ہُوئے پَر میں رہنا

کوئی سیفو ہو کہ میرا ہو کہ پروینؔ، اُسے
راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

دو گھڑی میسّر ہو اس کا ہم سفر ہونا
پھر ہمیں گوارا ہے اپنا در بدر ہونا

اِک عذاب پیہم ہے ایسے دورِ وحشت میں
زندگی کے چہرے پر اپنا چشم تر ہونا

اب تو اُس کے چہرے میں بے پناہ چہرے ہیں
کیا عجیب نعمت تھی ورنہ بے خبر ہونا

ہر نگاہ کا پتھر اور میرے بام و در
شہرِ بے فصیلاں میں کیا ستم ہے گھر ہونا

سوچ کے پرندوں کو اِک پناہ دینا ہے
دھوپ کی حکومت میں ذہن کا شجر ہونا

اُس کے وصل کی ساعت ہم پہ آئی تو جانا
کس گھڑی کو کہتے ہیں خواب میں بسر ہونا

میں ہجر کے عذاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہُوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی

آنے میں گھر مرے تجھے جتنی جھجک رہی
اس درجہ تو میں بے سرو سامان بھی نہ تھی

اتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو
وہ جا رہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

آراستہ تو خیر نہ تھی زندگی کبھی
پر تجھ سے قبل اتنی پریشان بھی نہ تھی

جس جا مکین بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اُس گھر میں ایک شام کی مہمان بھی نہ تھی

دُنیا کو دیکھتی رہی جس کی نظر سے میں
اُس آنکھ میں مرے لئے پہچان بھی نہ تھی

روتی رہی اگر تو میں مجبور تھی بہت
وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

نقدِ وفا کو چشمِ خریدار کیا ملے
اس جنس کے لئے کوئی دوکان بھی نہ تھی

آواز کے ہمراہ سراپا بھی تو دیکھوں
اے جانِ سخن! میں ترا چہرا بھی تو دیکھوں

دستک تو کچھ ایسی ہے کہ دل چھونے لگی ہے
اس حبس میں بارش کا یہ جھونکا بھی تو دیکھوں

صحرا کی طرح رہتے ہوئے تھک گئیں آنکھیں
دکھ کہتا ہے، اب میں کوئی دریا بھی تو دیکھوں

یہ کیا کہ وہ جب چاہے مجھے چھین لے مجھ سے
اپنے لئے وہ شخص تڑپتا بھی تو دیکھوں

اب تک تو مرے شعر حوالہ رہے تیرا
میں اب تری رسوائی کا چرچا بھی تو دیکھوں

اب تک جو سراب آئے تجھے انجانے میں آئے
پہچانے ہوئے رستوں کا دھوکا بھی تو دیکھوں

اک شخص کو سوچتی رہی مَیں
پھر آئینہ دیکھنے لگی مَیں

اُس کی طرح اپنا نام لے کر
خود کو بھی لگی نئی نئی مَیں

تُو میرے بنا نہ رہ سکا تو
کب تیرے بغیر جی سکی مَیں

آتی رہے اب کہیں سے آواز
اب تو ترے پاس آ گئی مَیں

دامن تھا ترا کہ میرا ماتھا
جو داغ بھی تھے مٹا چکی ہیں

دائرہ

کسی نے زندگی اور موت کی سرحد کا نقشہ
وقت کے ہاتھوں سے چھینا ہے
کہاں آبادیاں معدوم ہوتی ہیں
کہاں ویرانیاں یک لخت اُگ آتی ہیں
کس کے علم میں ہوگا
وبا کے خوف سے جب شہرِ مینو رنگ کے باشندگانِ اولیں
اور آخری گھر کے مکیں تک
بھاگ جائیں
تو بے آواز، بے مہکار اور بے لمس گھر
کچھ مر نہیں جاتے

کہیں سے کوئی مکڑی جھانکتی ہے
پھر در و دیوار اپنی ریشمیں تنہائی سے
آباد کرتی ہے
کہیں سے کوئی جھینگر، کوئی مکھی آن پھنستی ہے
بالآخر عنکبوتی کارِ ہستی چل نکلتا ہے
اداسی میں سیاہی رچنے لگتی ہے
تو قرب و دُور سے
چمگادڑیں آتی ہیں
اور گرتی چھتوں کو تھام لیتی ہیں
کبوتر منہ میں دابے کوئی بلّی
اور اُس کو سونگھتا کتّا
کوئی سہما ہُوا خرگوش
اور خرگوش کے پیچھے لپکتا بھیڑیا
اور بھیڑیے کی پُشت پر ایک شیر
اور پھر شیر کے پیچھے کوئی پیاسا شکاری

رائفل کی نال اور کھڑکی کے جالے صاف کرتے کرتے
آنے والی آخری راتوں کی خاطر
موم بتی چھوڑ جاتا ہے

یہ مدھم روشنی
اگلے مسافر کے سفر تک
اور پھر
اگلے مسافر کے ٹھہر جانے چلے جانے تلک
آباد رہتی ہے
یہاں تک کہ
کہیں سے کوئی مکڑی جھانکتی ہے ... ...
... ...

دی مِسنگ لِنک[1]

عجب ہے ارتقا کے باب کا یہ ذہن افگن مسئلہ
سارے عناصر
اپنی پہلے سے تعین کردہ ہیئت میں
کہیں سے جمع ہوتے ہیں
پھر اُس کے بعد بے حد خامُشی سے
واپسی کے طے شدہ رستوں پہ اک دن چل نکلتے ہیں
ازل سے زندگی کا دائرہ
یونہی سفر میں ہے

[1] THE MISSING LINK

عناصر کا تناسب اپنے منظر کے تناظر میں بدلتا ہے
تلاشِ رزق میں گردن فصیلِ جسم سے باہر نکل جائے
کبھی سارا ہنر پنجوں میں در آئے
کبھی تلوے ہی جھڑ جائیں
کچھاریں اور بھٹ اور غار اور اسکائی سکریپر
زمیں پر پھیلتے جائیں
کبھی آہستہ آہستہ
کبھی یک لخت
اور گاہے بہ گاہے
دونوں صورت میں
(ابھی دانشوروں میں یہ سخن کچھ اختلافی ہے)
مگر شجرہ ہمیں مطلوب ہے
جس ذی حشم، ذی شاں قبیلے کا
وہاں آ کر نسب نامہ

گھنے بالوں، مناسب شکل وصورت، قدوقامت تک
پہنچ کر گنگ ہوجاتا ہے
اُس کے بعد پھر بس ایک منزل
ایک لمحہ
ایک صدی
آنکھوں سے اوجھل ہے !

حقیقت یہ ہے لیکن
اگر تھوڑی سی سچّائی نظریں کھول کر
اِک دن ذرا سا اپنے گردوپیش کو
ہم دیکھ ڈالیں
تو یہ گم گشتہ حلقہ ایسے روشن ہو
کہ سب کھوئی ہُوئی کڑیاں
ہمارے ہاتھ آجائیں !

اگر تھوڑی سی جرأت
اور تنہائی میں آئینہ اُٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ بھی ہو
تو شاید
اتنی زحمت بھی نہیں کرنی پڑے ہم کو !

.... پھولوں کا کیا ہوگا ؟

سُنا ہے
تتلیوں پر پھر کوئی حد جاری ہوتی ہے
اگر گُل قند خود ہی شہد کی سب مکھیوں کے گھر پہنچ جائے
تو اُن کو گُل بہ گُل آوارہ گردی کی بے حاجت کیا
ہوا کی چال بھی کچھ نامناسب ہوتی جاتی تھی
سو تتلی اور مکھی اور ہوا
نامحرموں سے دُور رکھی جارہی ہیں
مگر یہ بھی کوئی سوچے
کہ پھر پھولوں کا کیا ہوگا
چمن میں ایسے کتنے پھول ہوں گے
کہ جو خود وصل اور خود بار آور ہوں !

سفر کی خواہش کسے نہیں ہے

سفر کی خواہش کسے نہیں ہے
کوئی پرندوں کی طرح اُڑنے کا آرزو مند ہے
کوئی ڈاک کے لفافے کی طرح محتاط، پا بہ منزل
کسی کی پرواز تا افق
اور کسی کی مکتوب الیہ تک ہے
یہ اپنے اپنے ارادے اور توشۂ سفر پر بھی منحصر ہے!

پرندوں اور جگنوؤں کے اور تتلیوں کے ہمراہ
بھاگنا

بھاگتے ہی رہنا
عجیب رومان تو ہے لیکن
سفر کی لذت کو اپنی پوروں میں
شہد بن کر اُترتے تب دیکھ پائیں گے ہم
کہ جب کہیں پر قیام بھی ہو
اور اس خبر کے لئے
ہوا کی مزاحمت کا
بدن کو ممنون ہونا ہوگا !

ہمارا المیہ یہ ہے

ہمارا المیہ یہ ہے
کہ ہم انکار کے رُومان میں
کچھ اس طرح سے مبتلا ہیں
کہ ہر موجود کو
اب صرف ناموجود کہنے میں ہی خوش ہوں گے
بزعم خود
کبھی سقراطؔ بن کر
اور کبھی منصورؔ کے الفاظ

بھری کھیل کی صورت میں
سادہ لوح انسانوں کے آگے
پیش کرتے ہیں
کوئی بھی خود کو ہرگز
والتیئر اور یار روسو سے تو کم گنتا نہیں ہے !

معافی مانگ کر
ہر شب امیر شہر سے
ہر صبح
گرفتاری کے حیلے ڈھونڈنا بھی
اپنا خاصا ہے
کبھی سرمایہ داروں
پہلی یا پھر دوسری دنیا کے رجعت گر
سفارت خانوں اور مکروہ بیورو کریٹس کے گھر میں
شرابیں پی کر

خود کو تیسری دنیا کا تیکھا انقلابی نشر کرتے ہیں

مثالِ سگ گزیدہ
اب کبھی آبِ رواں کا دیکھنا ممکن نہیں اپنا
کوئی ہم کو دکھائے بھی تو کیسے
پُلوں سے کتنا پانی بہہ چکا ہے !

عشق میں بھی مرنا اتنا آسان نہیں
ذات کو رَد کرنا اتنا آسان نہیں

مجھ میں ایسی ہی خامی دیکھی اس نے
ترکِ دفا ورنہ اتنا آسان نہیں

ایک دفعہ تو پاسِ مسیحا کر جائے
زخم کا پھر بھرنا اتنا آسان نہیں

جانے کب شہرت کا زینہ ڈھ جائے
پاؤں یہاں دھرنا اتنا آسان نہیں

مرنے کی دہشت تو سب نے دیکھی ہے
جینے سے ڈرنا اتنا آسان نہیں

جو دھوپ میں رہا نہ روانہ سفر پہ تھا
اُس کے لیے عذاب کوئی اور گھر پہ تھا

چکّر لگا رہے تھے پرندے شجر کے گرد
بچّے تھے آشیانوں میں، طوفان سر پہ تھا

جس گھر کے بیٹھ جاتے کا دُکھ ہے بہت ہمیں
تاریخ کہہ رہی ہے کہ وہ بھی کھنڈر پہ تھا

ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت
تارہ سا اک خیال تری چشمِ تر پہ تھا

سب زخم کھل اُٹھے تو سبک رنگ ہوں بہت
باقی یہ قرضِ ناخنِ دستِ ہنر پہ تھا

یہ کیا کیا کہ گھر کی محبت میں پڑ گئے
آوارگانِ شب کا تو ہونا سفر پہ تھا

دشمن کو مارنے سے بچانا عجیب تھا
ترکِ مدافعت کا بہانا عجیب تھا

اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر
ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا

زندہ بچا نہ قتل ہُوا طائرِ اُمید
اُس تیرِ نیم کش کا نشانہ عجیب تھا

سُنتے رہے اخیر تلک مہر و ماہ و نجم
اس خاکداں کا سارا فسانہ عجیب تھا

جس راہ سے کبھی نہیں ممکن ترا گزر
تیرے طلب گروں کا ٹھکانہ عجیب تھا

اب کے تو یہ ہُوا ہے کہ میرے بُلانے سے
اس زود رنج شخص کا آنا عجیب تھا

کھونا تو خیر تھا ہی کسی دن اُسے مگر
ایسے ہَوا مزاج کا پانا عجیب تھا

سب داغ بارشوں کی ہوائیں بُجھے رہے
بس دل کا ایک زخم پرانا عجیب تھا

یہ کیسا اذنِ تکلّم ہے جس کی تاب نہ ہو
سوال کرنے دیا جائے اور جواب نہ ہو

اگر خلوص کی دولت کے گوشوارے بنیں
تو شہر بھر میں کوئی صاحبِ نصاب نہ ہو

مِرا ہے زخمِ تمنّا تو اشک کیسے تھمیں
بہار میلے میں کیوں شرکتِ گلاب نہ ہو

تمہیں تو چشمۂ حیواں بھی کوئی دکھلائے
تو تجربہ یہ کہے گا، کہیں سراب نہ ہو

ہماری بے جہتی کا کوئی جواز نہیں
یہ دکھ تو اُن کا ہے جن کی کوئی کتاب نہ ہو

زمین اپنی محبت میں بے غرض تو نہیں
یہ اور بات کہ ہر ہاتھ کا حساب نہ ہو

ایک ایسی تتلی کہ بچّے کے لمس سے محروم
وہ نیند جس کے تعاقب میں کوئی خواب نہ ہو

ہے مسئلہ مرے سورج مُکھی قبیلے کا
کہ صبح نکلے مگر ساتھ آفتاب نہ ہو

چراغِ طاقِ تمنّا میں رکھ کے بھُول گئی
دُعا وہ مانگ رہی تھی جو مستجاب نہ ہو

کبھی نہ تنگ ہو اُس پر زمین کا دامن
امیرِ شہر اگر آسماں جناب نہ ہو

ہمارے قحط بھی اور بارشیں بھی پوری ہوئیں
ہمارے نام کا اب تو کوئی عذاب نہ ہو

سکوتِ خلق سمندر کی نیند ہوتا ہے
سکوں نہ جان بظاہر جو اضطراب نہ ہو

یہ چشمِ نم ہے اسے خشک دیکھ بھال کے کر
ہری بھری کوئی بستی ہی زیرِ آب نہ ہو

بس ایک نام کا تارا سدا چمکتا رہے
گلہ نہیں جو مقدر میں ماہتاب نہ ہو

چراغ مانگتے رہنے کا کچھ سبب بھی نہیں
اندھیرا کیسے بتائیں کہ اب تو شب بھی نہیں

میں اپنے زعم میں اِک بازیافت پر خوش ہوں
یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو ملا وہ اب بھی نہیں

جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے
میں اُس کی بزم میں اِک حرفِ زیرِ لب بھی نہیں

اور اب تو زندگی کرنے کے سو طریقے ہیں
ہم اُس کے ہجر میں تنہا تھے جب، بھی نہیں

کہاں شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اُس کے یہ دل ہو سکا اب بھی نہیں

یہ دستکیں، یہ مری زندگی کی آدھی رات
ہوا کا شور سمجھ لوں تو کچھ عجب بھی نہیں

یہ دُکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

حساب دربدری تجھ سے مانگ سکتا ہے
غریب شہر مگر اتنا بے ادب بھی نہیں

ہمیں بہت ہے، یہ سادات عشق کی نسبت
کہ یہ قبیلہ کوئی ایسا کم نسب بھی نہیں

نوشتہ

. . . . تب زید نے بکر کو گالی دیتے ہوئے کہا :
کہ اس (بکر) کی ماں اس کے باپ سے زیادہ مشہور تھی

مرے بچے !
ترے حصے میں بھی یہ تیر آئے گا
تجھے بھی اس پدر بنیاد دُنیا میں ، بالآخر
اپنے یوں مادر نشاں ہونے کی ، اِک دن
بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی

اگرچہ
تیری ان آنکھوں کی رنگت
تیرے ماتھے کی بناوٹ
اور ترے ہونٹوں کے سارے زاویے
اُس شخص کے ہیں
جو تری تخلیق میں ساجھی ہے میرا
فقیہ شہر کے نزدیک جو پہچان ہے تیری
مگر جس کے لہو نے تین موسم تک تجھے سینچا ہے
اُس تنہا شجر کا
ایک اپنا بھی تو موسم ہے
لہو سے فصل تارے چھاننے کی
سوچ سے خوشبو بنانے کی رُتیں
اور شعر کہنے کا عمل
جن کی عملداری ترے اجداد کے قلعوں سے باہر جا چکی ہے
اور جسے واپس بلا سکنا

نہ سیفوؔ کے لیے ممکن رہا تھا
نہ میراؔ کے ہی بس میں تھا!

سو اب ہمجولیوں میں
گاہے گاہے تیری خجالت
واقفوں کے آگے تیرے باپ کی مجبور خفت
اس گھرانے کا مقدر ہو چکی ہے
کوئی تختی لگی ہو صدر دروازے پہ لیکن
حوالہ ایک ہی ہو گا
ترے ہونے نہ ہونے کا!

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰن

دلآزاری بھی اک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
ساری زندگی اسی کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے اُن کا بُرج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں
تیسرے درجے کے پیلے اخباروں پر یہ
اپنی یرقانی سوچوں سے
اور بھی زردی مَلتے رہتے ہیں

مالا باری کیبن ہوں یا پانچ ستارہ ہوٹل
کہیں بھی قے کرنے سے باز نہیں آتے
اوپر سے اس عمل کو
فقرے بازی کہتے ہیں
جس کا پہلا نشانہ عموماً
بل کو ادا کرنے والا ساتھی ہوتا ہے :

اپنے اپنے کنوئیں کو بحرِ اعظم کہنے اور سمجھنے والے
یہ ننھے مینڈک
ہر ہاتھی کو دیکھ کے پھُولنے لگتے ہیں
اور جب پھٹنے والے ہوں تو
ہاتھی کی آنکھوں پر پھبتی کسنے لگتے ہیں

کوّے بھی انڈے کھانے کے شوق کو اپنے
فاختہ کے گھر جا کر پُورا کرتے ہیں

لیکن یہ وہ سانپ ہیں جو کہ
اپنے بچّے
خود ہی چٹ کر جاتے ہیں

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ
سانپوں کی یہ خصلت
مالکِ جنّ و انس کی، انسانوں کے حق میں
کیسی بے پایاں رحمت ہے!

فروغ فرّخ زاد کے لئے ایک نظم

مصاحبِ شاہ سے کہو کہ
فقیہہِ اعظم بھی آج تصدیق کر گئے ہیں
کہ فصل پھر سے گناہ گاروں کی پک گئی ہے
حضور کی جنبشِ نظر کے
تمام جلّاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاری کریں

تو تعمیلِ بندگی ہو ۔۔۔

کہاں پہ سر اور کہاں پہ دستار اُتارنا احسن العمل ہے
کہاں پہ ہاتھوں، کہاں زبانوں کو قطع کیجئے
کہاں پہ دروازہ رزق کا بند کرنا ہو گا
کہاں پہ آسائشوں کی بھوکوں کو مار دیجے
کہاں بٹے گی لعان کی چھوٹ
اور کہاں پر
رجم کے احکام جاری ہوں گے
کہاں پہ نو سالہ بچیاں، چہل سالہ مردوں کے ساتھ
سنگین میں پڑنے کا حکم ہو گا

کہاں پہ اقبالی ملزموں کو
کسی طرح شک کا فائدہ ہو
کہاں پہ معصوم دار پر کھینچنا پڑے گا
حضور احکام جو بھی جاری کریں
فقط التجا یہ ہو گی

کہ اپنے ارشادِ عالیہ کو
زبانی رکھیں
وگرنہ
قانونی اُلجھنیں ہیں !

پاسبانی پہ اندھیرے کو تو گھر پر رکھا
اور چراغوں کو تری راہگزر پر رکھا

رہ گیا ہاتھ سدا تیغ و سپر پر رکھا
ہم نے ہر رات کا انجام سحر پر رکھا

ہاتھ اٹھائے رہے ہر لمحہ دعا کی خاطر
اور الفاظ کو تنسیخ اثر پر رکھا

بے وفائی مری فطرت کے عناصر میں ہوئی
تیری بے مہری کو اسباب دگر پر رکھا

اتنا آسان نہ تھا ورنہ اکیلے چلنا
تجھ سے ملتے رہے اور دھیان سفر پر رکھا

اُس کی خوشبو کا ہی فیضان ہیں اشعار اپنے
نام جس زخم کا ہم نے گلِ تر پر رکھا

پانی دیکھا، نہ زمیں دیکھی، نہ موسم دیکھا
بے ثمر ہونے کا الزام شجر پر رکھا

(منیر نیازی کی زمین میں)

میں فقط چلتی رہی منزل کو سر اُس نے کیا
ساتھ میرے روشنی بن کر سفر اُس نے کیا

اس طرح کھینچی ہے میرے گرد دیوار خبر
سارے دشمن روزنوں کو بے نظر اُس نے کیا

مجھ میں بستے سارے سناٹوں کی لے اس سے بنی
پتھروں کے درمیاں تھی نغمہ گر اُس نے کیا

بے سر و ساماں پہ دلداری کی چادر ڈال دی
بے در و دیوار تھی میں مجھ کو گھر اُس نے کیا

پانیوں میں یہ بھی پانی ایک دن تحلیل تھا
قطرۂ بے صرفہ کو لیکن گہر اُس نے کیا

ایک معمولی سی اچھائی تراشی ہے بہت
اور فکر خام سے صرف نظر اُس نے کیا

پھر تو امکانات پھولوں کی طرح کھلتے گئے
ایک ننھے سے شگوفے کو شجر اُس نے کیا

طاق میں رکھے دیے کو پیار سے روشن کیا
اِس دیے کو پھر چراغ رہگزر اُس نے کیا

پھیلا دیے خود ہاتھ طلب گار کے آگے
دیکھا نہیں کچھ ہم نے خریدار کے آگے

پھر شام ہوئی اور بڑھا ناخنِ اُمید
پھر صبح ہے اور ہم اسی دیوار کے آگے

شہزادے! مری نیند کو تو کاٹ چکا ہے
ٹھہرا نہ یہ جنگل تری تلوار کے آگے

کیا جاں کے خسارے کی تمنا ہو کہ اب عشق
بڑھتا ہی نہیں درہم و دینار کے آگے

وہ ابر لگی زخشِ زمانہ کو کہ اب تو
اسوار سراسیمہ ہے رہوار کے آگے

پھر روزۂ مریم جو فقیہوں میں ہے مقبول
عاجز تھے بہت وہ مری گفتار کے آگے

انکار کی لذت میں جو سرشار رہے ہیں
کب ٹوٹ سکے ہیں رسن و دار کے آگے

یا قوس رکھے یا وہ ہمیں دائرہ کر دے
نقطے کی طرح ہیں کسی پرکار کے آگے

جاں اپنی ہے اور آبرو نسلوں کی کمائی
سر کون بچاتا پھرے دستار کے آگے

گھمسان کا رن جیت کے لب بستہ کھڑی تن
تن پشت سے آنے تو نے اک وار کے آگے

عجب مکاں ہے کہ جس میں مکیں نہیں آتا
حدودِ شہر میں کیا دل کہیں نہیں آتا

میں جس کے عشق میں گھر بار چھوڑ بیٹھی تھی
یہی وہ شخص ہے مجھ کو یقیں نہیں آتا

مزہ ہی شعر سنانے کا کچھ نہیں جب تک
قصیدہ گویوں میں وہ نکتہ چیں نہیں آتا

فشارِ جاں کے بہت ہیں اگر نظر آئیں
ہر ایک زلزلہ زیرِ زمیں نہیں آتا

بھرم ہے مہر و مہ و نجم کا بھی بس جب تک
مقابل اِن کے وہ روشن جبیں نہیں آتا

یوں چاہے خزاں کھڑی ہو دِل میں
اِک آس کی پنکھڑی ہو دِل میں

کیا ناخنِ مہر و مہ سے کٹتی
جس شب کی گرہ پڑی ہو دِل میں

وہ سامنے ہو تو معرکہ اور
جنگ اُس سے الگ لڑی ہو دِل میں

اُس نام پہ مُسکرائے جانا
اشکوں کی مگر جھڑی ہو دِل میں

مصلوب نہیں مگر یہ احساس
اِک میخ ابھی گڑی ہو دِل میں

ایک مشورہ

درونِ گفتگو
بامعنی وقفے آنے لگ جائیں
تو باقی گفتگو
بے معنی ہو جاتی ہے
سو اے خوش سخن میرے!
ہمیں اب خامشی پر دھیان دینا چاہیئے اپنی!

مجھے مت بتانا

مجھے مت بتانا
کہ تم نے مجھے چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا
تو کیوں
اور کس وجہ سے
ابھی تو تمہارے بچھڑنے کا دُکھ بھی نہیں کم ہُوا
ابھی تو میں
باتوں کے وعدوں کے شہرِ طلسمات میں
آنکھ پر خوش گمانی کی پٹی لیے

تم کو پیڑوں کے نیچے، درختوں کے جُھنڈ
اور دیوار کی پُشت پر ڈھونڈنے میں مگن ہوں
کہیں پر تمہاری صدا اور کہیں پر تمہاری مہک
مجھ پہ ہنسنے میں مصروف ہے
ابھی تک تمہاری ہنسی سے نبرد آزما ہوں
اور اس جنگ میں
میرا ہتھیار
اپنی وفا پر بھروسہ ہے اور کچھ نہیں
اسے کند کرنے کی کوشش نہ کرنا
مجھے مت بتانا.....

چہ کنم

بے بسی کے رستے پر
کیا عجب دوراہا ہے
ایک سمت بے سمتی
بے چراغ تاریکی
بے لباس ویرانی
بے لحاظ رسوائی
بے سواد قربانی
خشت پایۂ تنہائی

اژدری پذیرائی
گرگ زادغم خواری
بے کنار روباہی

اور دُوسری جانب
قلعہ بندچاہت میں
دل کی آبروریزی:

بے یقینی کی ایک نظم

نہ کوئی عہد، نہ پیمان
نہ وعدہ ایسا
نہ ترا حسن ہی ایسا کوئی انگشت تراش
نہ مرے ہاتھ میں تاثیر زلیخائی ہے
رقص گہ ہے یہ جہاں اور نہ میں سنڈریلا ہوں
نہ تو شہزادہ ہے
ہم تو بس رزم گہ ہستی میں
دو مبارز دل ہیں
اس تعلق کا کوئی رنگ اگر ہے تو حریفانہ ہے

ایک ہی تھال سے چکھنی ہے ہمیں نانِ جویں
ایک ہی سانپ کے منہ سے ہمیں من چھیننا ہے
اور اس کشمکشِ رزق میں موہوم کشائش کی کلید
جس قدر میری قناعت میں ہے
اتنی تیری فیاضی میں
میں تری چھاؤں میں پروان چڑھوں
اپنی آنکھوں پہ ترے ہاتھ کا سایہ کر کے
ترے ہمراہ میں سورج کی تمازت دیکھوں
اس سے آگے نہیں سوچا دل نے
پھر بھی احوال یہ ہے
اک بھروسہ ہے کہ دل سبز کیئے رکھتا ہے
ایک دھڑکا ہے کہ خوں سرد کیئے رہتا ہے

گھر کے مٹنے کا غم تو ہوتا ہے
اپنے ملبے پہ کون سوتا ہے

خوشبوئے غیر تن سے آتی ہے
بازوؤں میں مجھے سموتا ہے

میرے دل! آنسوؤں سے ہاتھ اٹھا
کیسی بارش سے زخم دھوتا ہے

شام ہوتے ہی میری پلکوں پر
کون یہ ہار سا پروتا ہے

رات کے بیکراں اندھیرے میں
کوئی جگنو کی نیند سوتا ہے

عمر کا بھروسہ کیا پل کا سات ہو جائے
ایک بار اکیلے میں اس سے بات ہو جائے

دل کی گنگ سرشاری اُس کو جیت لے لیکن
عرض حال کرنے میں احتیاط ہو جائے

ایسا کیوں کہ جانے سے صرف ایک انساں کے
ساری زندگانی ہی بے ثبات ہو جائے

یاد کرتا جائے دل اور کھلتا جائے دل
اوس کی طرح کوئی پات پات ہو جائے

سب چراغ گُل کر کے اُس کا ہاتھ تھاما تھا
کیا قصُور اس کا، جو بن میں رات ہو جائے

ایک بار کھیلے تو وہ مری طرح اور پھر
جیت لے وہ ہر بازی مجھ کو مات ہو جائے

رات ہو پڑاؤ کی پھر بھی جاگیے ورنہ
آپ سوتے رہ جائیں اور ہات ہو جائے

خواب کیا دیکھے کوئی نیند کے انجام کے بعد
کس کو جینے کی ہوس حشر کے ہنگام کے بعد

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

ایک ہی اسم کو بارش نے ہرا رکھا ہے
پیڑ پہ نام تو لکھے گئے اس نام کے بعد

ہندسے گدھ کی طرح دن مرا کھا جاتے ہیں
حرف ملنے مجھے آتے ہیں ذرا شام کے بعد

موت وہ ساقی کہ جس کے کبھی تھکتے نہیں ہاتھ
بھرتی جائے گی سدا جام وہ اک جام کے بعد

تھک کے میں بیٹھ گئی اب مگر اے سایۂ طلب
کس کی خیمے پہ نظر جاتی تھی ہر گام کے بعد

دل کا کیا ہے وہ تو چاہے گا مسلسل مِلنا
وہ ستم گر بھی مگر سوچے کسی پَل مِلنا

واں نہیں وقت تو ہم بھی ہیں عدیم الفرصت
اُس سے کیا ملیے جو ہر روز کہے "کل" مِلنا

عشق کی رہ کے مسافر کا مقدر معلوم
شہر کی سوچ میں ہو اور نئے جنگل ملنا

اُس کا مِلنا ہے عجب طرح کا مِلنا جیسے
دشتِ اُمید میں اندیشے کا بادل مِلنا

دامنِ شب کو اگر چاک بھی کریں تو کہاں
نُور میں ڈُوبا ہُوا صبح کا آنچل مِلنا

لفظ بڑھے اور وعدے پھیلے دل کی حکایت ختم ہوئی
وہاں ہوس کا پھن لہرایا جہاں محبت ختم ہوئی

وہ بھی نہیں کہتا ملنے کو ہمیں بھی کچھ اصرار نہیں
سر سے سودا اُتر گیا اور دِل سے چاہت ختم ہوئی

جتنی کم سچائی ہو گی اتنی ہو گی آرائش
جب مضمون سے لفظ ہوں زاید سمجھو عبارت ختم ہوئی

جب تک سجدہ اُس کے نام پہ اُس کے حضور ہے تب تک ہے
کام خدا سے کیا یاد آیا ساری عبادت ختم ہوئی

دل کے غزال کو سارا رم صحرا کی وسعت دیتی ہے
شہرِ رزق میں آ نکلا اور ساری وحشت ختم ہوئی

بھَٹ

بھیڑیے کے آنے سے
ایک دو گھڑی پہلے
ایک سنسناتی بُو
بَن میں پھیل جاتی ہے

آج میرے گھر میں بھی
میری تیسری حِس نے
کوئی بات دیکھی ہے

اِتنی دیر میں میں نے
تیسری کہ چوتھی بار
گھر کے کونے کونے میں
پھر گلاب چھڑکا ہے

پھر گلاب کی ڈھالیں
کیا مجھے بچا لیں گی؟

انہونی کی ایک دُعا

چاندی کا یہ تار
میرے سیہ بالوں میں
گھڑی گھڑی بجلی کی طرح چمکتا ہے
سوتے جاگتے میں اس لشکارے کی زد میں رہتی ہوں!
ایک لمحہ تو جیسے دل ہی ٹھہر گیا تھا!
آئینہ
عمر میں پہلی دفعہ
سچ بولتا نہیں لگا تھا
شک کا فائدہ بینائی کو دیا تھا میں نے
لیکن کتنے عرصے؟

(فیصلہ کتنا ٹلتا!)

کتنے آئینے چُپ رہتے
اور کتنی آنکھیں میرا دل رکھ سکتی تھیں
جان گئی ہوں
وقت
مری برنائی پر
پہلا شب خوں ڈال چکا ہے!

کیسے کیسے چہرے نظر میں گھوم رہے ہیں
فرطِ محبت سے گلنار
جوشِ عقیدت سے سرشار
مجھ کو دیکھنے، مجھ کو چھونے، مجھ کو پانے کی حسرت میں
کوچہ بہ کوچہ خوار
سرتاپا دلدار

آج ہمہ تن چشم وہ لوگ
مجھ کو کیسے دیکھیں گے
دیکھ سکیں گے ؟
مالک ! اس انبوہِ طلب میں
کیا کوئی ایسی آنکھ بھی ہو گی
جس کی چمک
بجھ جانے کی بجائے
چاندی کے اس تار کو چھو کر
سونے جیسی ہو جائے ؟

اِک تنہا سیّارہ

میری پیشانی کو دیکھ کے
میری ماں نے میرا نام
اِک تارے کے نام پہ رکھا
جگمگ کرنے والا
لیکن میری کیمسٹری میں
ایسا کوئی طلسم نہیں ہے
جو میری تقدیر کو جھلمل کر دے
میری مانگ میں اُس کے نام کی افشاں بھر دے!

فرزندِ زمیں سے

اِک چوتھائی صدی سے زاید ساتھ کے بعد
جس گھر کی بنیادوں میں جذبے نے رکھا
میری ماں کا دوپٹہ، میرے باپ کی پگ
جس کی دیواروں میں میرے خواب تمام
چُونے اور گچ کی صُورت چُن دیے گئے
اُس گھر کی چھت کا مالک مجھ سے کہتا ہے
تُم ہم میں سے نہیں ہو!

میں اس فردِ جرم کے آگے
سر کو جھکائے کھڑی ہوئی ہوں
عرق آلود اور مہر بہ لب
سوچ رہی ہوں
کیا یاثرب سے آنے والی تیکھی ہوا کی سرگوشی سچ ہے
میرے آقاؐ
جن پر میرے اور تمہارے آباؤ اجداد نثار
اُن کے اور یثرب کے بیچ
ایک صدا کا فاصلہ تھا
اس مٹی کی خوشبو میں بسنے کے لیئے
مجھ کو ہیں درکار
کتنے دن اور کتنے برس اور کتنی صدیاں بھائی ؟

دُنیا کو تو حالات سے اُمّید بڑی تھی
پر چاہنے والوں کو جُدائی کی پڑی تھی

کس جانِ گلستاں سے یہ ملنے کی گھڑی تھی
خوشبو میں نہائی ہُوئی اِک شام کھڑی تھی

میں اُس سے ملی تھی کہ خود اپنے سے ملی تھی
وہ جیسے مری ذات کی گُم گشتہ کڑی تھی

یُوں دیکھنا اُس کو کہ کوئی اور نہ دیکھے
انعام تو اچھا تھا مگر شرط کڑی تھی

کم مایہ تو ہم تھے مگر احساس نہیں تھا
آمد تری اس گھر کے مقدّر سے بڑی تھی

میں ڈھال لیے سمت عدو دیکھ رہی تھی
پلٹی تو مری پشت پہ تلوار گڑی تھی

چاند چہروں کے فروزاں تھے کہ ناموں کے گلاب
شاخِ مژگاں پہ مہکتے رہے یادوں کے گلاب

تیری زیبائی سلامت رہے اے قامتِ دوست!
زیبِ پوشاک رہیں گے مرے زخموں کے گلاب

جی اُٹھی خاک نمی پا کے مرے اشکوں کی
کِھل رہے ہیں مری گِل میں نئے خوابوں کے گلاب

اُس نے چُوما مری آنکھوں کو سحر دم اور پھر
رکھ گیا میرے سرہانے مرے خوابوں کے گلاب

کون چھُو کر انہیں گزرا کہ کھِلے جاتے ہیں
اتنے سرشار تو پہلے نہ تھے ہونٹوں کے گلاب

دوپہر شام ہوئی، شام شبِ تار ہوئی
اور کھِلتے رہے، کھِلتے رہے باتوں کے گلاب

سرحدِ نُور پہ اس طرح سے خوشبو پہنچی
چاند پھُولوں کے ہُوئے اور بنے تاروں کے گلاب

اِک صدا پُکارے جاتی ہے

گھنے گھنگھریالے بالوں والا شہزادہ
وارث شاہ کے دیس کا رہنے والا
اُونچا قد اور اُس سے اُونچا شملہ
روشن ماتھا اور اُس پر اقبال کا چاند
بھُوری آنکھیں اور اُن میں سچے موتی
ترشے ہوئے لب اور مہکتے میٹھے بول
کڑیل ایسا
اپنی بائیں ہتھیلی پر وہ مجھے اُٹھا لے
یُوں چلتا ہے

جیسے زمین فقط اُس کے قدموں کے لیے بنی ہے
کم کم بولنے
اور زیادہ دیکھنے والا
میرے چاروں جانب
اپنے وجود کی ونجلی بجائے جاتا ہے
اُس سے ہزاروں کوس کی دُوری پر بیٹھی ہوں
اور پھر بھی
اِک صدا پکارے جاتی ہے
میرے نام کو سانجھ سویرے
اِک تان بلائے جاتی ہے
مجھے پل پل تخت ہزارے!

ایک خط

بہت یاد آنے لگے ہو
بچھڑنا تو ملنے سے بڑھ کے
تمہیں میرے نزدیک لانے لگا ہے
میں ہر وقت خود کو
تمہارے جواں بازوؤں میں پگھلتے ہوئے دیکھتی ہوں
مرے ہونٹ اب تک

تمہاری محبت سے نم ہیں
تمہارا یہ کہنا غلط تو نہ تھا کہ
مرے لب تمہارے لبوں کے سبب سے ہی گلنار ہیں
تو خوش ہو
کہ اب تو مرے آئینے کا بھی کہنا یہی ہے
میں ہر بار بالوں میں کنگھی ادھوری ہی کر پا رہی ہوں
تمہاری محبت بھری انگلیاں روک لیتی ہیں مجھ کو
میں اب مانتی جا رہی ہوں
میرے اندر کی ساری رُتیں
اور باہر کے موسم
تمہارے سبب سے
تمہارے لئے تھے!

جواباً

خزاں مجھ میں چھا ہو گے تم دیکھنا
یا کہ فصلِ بہاراں
کوئی فیصلہ ہو
مگر جلد کر دو تو اچھا!

جُدائی کے بندی خانے میں...

بس اب تو جینے کا ایک ہی سلسلہ ہے جاناں :
تمہاری سوچوں میں ڈوبے رہنا
تمہارے خوابوں میں کھوئے رہنا
کسی طرح تم کو دیکھنے کی سبیل کرنا
تمہارے کوچے تک آنے کا کچھ بہانہ کرنا
ہر آتے جاتے سے خیریت کی نوید لینا
ہواؤں اور چاند اور پرندوں پہ رشک کرنا

مرا جو احوال پُوچھنا ہے تو یہ ہے جاناں !
کہ جانے کب سے
جُدائی کے بندی خانے میں بند
برف کی سِل پہ تنہا بیٹھی
حرارتِ زندگی سے کچھ ربط ڈھونڈتی ہوں
بدن کو اپنے
تمہارے ہاتھوں سے چھُو رہی ہوں !

ایک سوال - دُور جا بسنے والوں سے

پھر وہی بسترِ سنجاف پہ کانٹوں کی بہار
پھر سے شب خوابی کے ملبوسِ حریری میں تنِ زار کی آگ
پھر تری یاد میں جلتے دل کو
کسی پہلو نہیں آتا ہے قرار
اے مرے خواب چراغ
تیرا پیراہنِ آبی بھی اسی طرح شرر بار ہے کیا
اور تری چشم سبک خواب سے بھی

نیند بیزار ہے کیا
یا ہمیشہ کی طرح
تیرے لئے رقصِ دلآرام ہے رات
نیند کے شانوں پہ سر رکھے ہوئے سوتا ہے
مے کے اور ساقیٔ محفل کے اثر سے تیری
آنکھ میں ہلکے گلابی ڈورے
مسکراتا ہوا تنہائی پر
تو مری یاد غلط کرنے کو جا نکلا ہے ؟

کریں ترکِ زمیں یا جائیں جاں سے
وہی انداز اُن کے آسماں سے

اگر چاہیں تو وہ دیوار پڑھ لیں
ہمیں اب کچھ نہیں کہنا زباں سے

ستارہ ہی نہیں جب ساتھ دیتا
تو کشتی کام لے کیا بادباں سے

ضروری ہو گئی اب دل کی زینت
مکیں پہچانے جاتے ہیں مکاں سے

بساطِ زیست پر اکثر زمانہ
پلٹ لیتا ہے اپنے حق میں پانسے

وگرنہ فصلِ گُل کی قدر کیا تھی
بڑی حکمت ہے وابستہ خزاں سے

کسی نے بات کی تھی ہنس کے شاید
زمانے بھر سے ہیں ہم خوش گماں سے

کبھی تنہائی کا ڈر روکتا تھا
اور اب مشکل ہجوم ہمرہاں سے

الاؤ ہی جلانے کی شبیں ہیں
مگر ہٹ کر کسی کے سائباں سے

سبھی سودے خسارے کے نہیں تھے
مگر فرصت نہ تھی کارِ جہاں سے

محبّت اور وہ بھی غیر مشروط
بہت مشکل ہے ایسے مہرباں سے

نکالی بھی گئی تھیں سوئیاں کب
کوئی تصدیق کرتا قصّہ خواں سے

میں اِک اِک تیر پر خود ڈھال بنتی
اگر ہوتا وہ دشمن کی کماں سے

جو سبزہ دیکھ کر خیمے لگائیں
انہیں تکلیف کیوں پہنچے خزاں سے

جو اپنے پیڑ جلتے چھوڑ جائیں
انہیں کیا حق کہ روٹھیں باغباں سے

چراغ میلے سے باہر رکھا گیا وہ بھی
ہوا کی طرح سے نامعتبر رہا وہ بھی

زمین زاد بھی بھُولا جو لفظِ رہداری
فصیلِ شہر سے باہر کھڑا رہا وہ بھی

میں اُس کے سارے رویّوں پہ معترض ہوتی
مری طرح سے مگر تھا دُکھا ہوا وہ بھی

گلی کے موڑ پہ دیکھا اُسے تو کیسی خوشی
کسی کے واسطے ہو گا رُکا ہوا وہ بھی

میں اُس کی کھوج میں دیوانہ وار پھرتی رہی
اسی لگن سے کبھی مجھ کو ڈھونڈتا وہ بھی

نظر بھی آیا اُسے اپنے پاس بھی دیکھا
مری نگاہ نے یہ التباس بھی دیکھا

بہت دنوں پہ چلے اور گھر سے چلتے وقت
کسی کی آنکھ سے اپنا لباس بھی دیکھا

یہی کہا کہ نہیں اُس کا راستہ تھا الگ
پھر اُس کے بعد ہی خود کو اُداس بھی دیکھا

مقابلے پہ زمانے کے آ گئے اور پھر
بہ پیشِ آئینہ دل کا ہراس بھی دیکھا

وہ مجھ میں سوچ کے کس زاویے سے روشن ہو
یقیں بھی دیکھ لیا ہے، قیاس بھی دیکھا

سب اچھا کہتے ہوؤں کا ہراس بھی دیکھا
امیرِ شہر، کبھی آس پاس بھی دیکھا

جو پیڑ اہلِ گلستاں کا ستر ڈھکتا رہا
اُنہی کے ہاتھوں، اُسے بے لباس بھی دیکھا

جو صبح سرمد و منصور تھے، انہیں سرِ شام
حضورِ شاہ سراپا سپاس بھی دیکھا

تمام رات جو خندق میں ریت بھرتا رہا
اُسی کو شہر کی خاطر اداس بھی دیکھا

کھلا کسی پہ نہ جس کا کبھی سیاق و سباق
کتابِ زیست میں وہ اقتباس بھی دیکھا

ایک غیر زمینی رات

جاڑے کی اُداس چاندنی میں
راوی کے حسین پانیوں میں
اِک ناؤ خموش بہہ رہی تھی
کشتی کے شکستہ دل مسافر
دریا کے سکوت سے ہراساں
ماحول کی طرح دم بخود تھے

ایک غیر زمینی دلکشی نے
بانہوں میں سبھوں کو لے لیا تھا
اک نور تھا کوئی ماورائی
جو پردۂ غم ہٹا رہا تھا
سب زخم پرانے جاگ اُٹھے تھے
دکھ آنکھوں میں ایسے آ گئے تھے
ہم خود سے نظر چرا رہے تھے!

ایک خوبصورت ڈرائیو

اسی راستے پر
میں کب سے سفر کر رہی تھی
کبھی نیم تنہا
کبھی دوستوں کی معیت میں
اور کبھی

اس طرح بھی
کہ چلتی رہی اور ذرا سمت تک جاننے کی ضرورت نہ سمجھی

مگر آج اک اجنبی کے
دلآویز، کم بولتے ساتھ میں
ستمبر کی تپتی ہوئی دوپہر میں
میں نے پہلی دفعہ یہ بھی دیکھا
کہ اس راستے پر
دو رویہ گلابوں کے تختے بچھے ہیں!

آج کی رات

آج کی رات تو سونے کی نہیں ہے جاناں !
آج کی رات ہے تجدیدِ ملاقات کی رات
العطش کہتے ہُوئے جسم کی
پیہم آواز
الاماں کہتی ہُوئی رُوح کی
بے چین صدا
تیز بارش کی دُعاؤں میں تجھے یاد کئے
ایک مُدّت سے ہے بوجھ دلِ خستہ پر
تیری خواہش کا، ترے قرب کی آسائش کا

ساتھ دیکھے ہُوئے خوابوں کا نشہ آنکھوں میں
ساتھ سوچی ہُوئی باتوں کی دھنک نظروں میں
رات کے ہاتھ میں کیا ہاتھ دیا ہے دل نے
پاؤں پڑتے ہی نہیں جیسے زمیں پر اس کے
روشنی کیسی رگ و پے میں اُتر آئی ہے
دُور تک صرف تری شکل نظر آتی ہے
میرے ہاتھوں میں ترے چہرے کا بے داغ کنول
تازہ بارش میں تو کچھ اور کھلا جاتا ہے
میری آنکھیں
ترے ہونٹوں کی نمی سے سرشار
ساری دُنیا سے چھپائے
تری بانہوں کا حصار
ذہن میں گھومتا ہے پہلے پہل کا ملنا
اور پھر رنگِ ملاقات کا گہرا ہونا
اور پھر ملنے کی خواہش کا سمندر ہونا

دھیرے دھیرے
کسی تصویر کے ٹکڑے ملنا
جس کی ترتیب نے دو روحوں کا سمبندھ کیا

اور یہ سچ ہے
کہ حیرت کدۂ ہستی میں
ایک پہچان کا لمحہ بھی بہت ہوتا ہے
ہم پہ اِس لمحے کا کچھ قرض ہے باقی اب تک
تن میں تن جذب کریں
روح میں روح سموئیں
کہ یہ ساعت ہے تشکّر کے لئے
ریگِ صحرا پہ اُتر آئی ہے برسات کی رات
آج کی رات ہے تجدیدِ ملاقات کی رات !

وہ مجبُوری نہیں تھی، یہ اداکاری نہیں ہے
مگر دونوں طرف پہلی سی سرشاری نہیں ہے

بہانے سے اُسے بس دیکھ آنا پل دو پل کو
یہ فردِ جُرم ہے اور آنکھ انکاری نہیں ہے

میں تیری سرد مہری سے ذرا بَددِل نہیں ہوں
مرے دشمن! ترا یہ وار بھی کاری نہیں ہے

میں اُس کے قول پر ایمان لاکر خوف میں ہوں
کہیں بھیجے میں تو ظالم کے عیاری نہیں ہے

پلٹنے کا ارادہ ہو سکے تو تم بھی کر لو !
یہ بازی آج تک دل نے کبھی ہاری نہیں ہے

جہاں اِک روز کھل جائیں ہمارے نام کے پھُول
بھرے گلشن میں کیا ایسی کوئی کیاری نہیں ہے

سکوتِ شہر تو پھر بھی سمجھ میں آ رہا ہے
پسِ دیوار بھی کیا گریہ و زاری نہیں ہے

بچھڑنے والے اتنے ہو گئے ہیں شہر در شہر
کہ باقی اب کسی گھر میں عزاداری نہیں ہے

مرنے سے بھی پہلے مر گئے تھے
جینے سے کچھ ایسے ڈر گئے تھے

رستے میں جہاں تلک دیے تھے
سارے مرے ہم سفر گئے تھے

آنکھیں ابھی کھُل نہیں سکی تھیں
اور خواب مرے بکھر گئے تھے

جب تک نہ کھلا تھا اُس کا وعدہ
موسم مرے بے ثمر گئے تھے

گرداب سے بچنے والوں کی سمت
ساحل سے کئی بھنور گئے تھے

ق

اب تک وہی نشّۂ پذیرائی
کل خواب میں اُس کے گھر گئے تھے

مِلتا نہ تھا واپسی کا رستہ
کیا جانیے ہم کدھر گئے تھے

ایک شاعرہ کے لیے

بھیڑیے اور ہرنی کی دوستی کبھی نہیں ممکن ہے
ذرا سی چھاؤں کی آس میں تُو نے
کیسے گھر کو چھوڑا
مانا کہ دیوار تھی کچّی
اور ٹپکتی رہتی تھی چھت
خواب گاہ میں شام شام تک دھوپ بھری رہتی تھی
لیکن وہ مٹّی جس پر یہ گھر اِستادہ تھا
جس پر تیرے پاؤں جمے تھے

وہ تو تیری اپنی تھی
سدا محبّت کرنے والی
ماں کی طرح، ترے سب تیکھے لہجوں کو
ہنس ہنس کے سہہ جاتی تھی
تیرا آنچل
جب بھی کسی کانٹے سے اُلجھا
یا تیری بے خبری میں سر سے ڈھلکا
کون تھا جس نے تیری ردائے عفّت ڈھونڈی
آندھی اور سیلاب کے بڑھتے ریلے میں
تیرے وجود کے ننھے سے پتّے کو کس نے تھاما تھا
شہر کا شہر جب تجھ پہ باتیں کرتا تھا
کس نے تیرے سر پہ ہاتھ رکھا تھا
جب بھی بارش تیز ہوئی تو تیری خاطر
کس کے بازو پھیلے تھے
جب بھی زور ہوا نے باندھا

تیرے گھر کے سارے دیوں کو کس نے جلائے رکھا تھا
تیرے اِک اِک شعر کو کس نے سرمۂ چشم بنایا تھا
آج وطن پر وقت پڑا تو
تجھ کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا
ماں کی خدمت
پھولوں اور تحفوں سے کب ہو سکتی ہے
اُسے تو تیرے لمس کی حدّت ہے درکار
تجھے نئی دُنیا کی مبارکباد
مگر یہ بات گرہ میں باندھ کے رکھ لے
جس جنگل کو تو نے اپنا گھر سمجھا ہے
بھیڑیوں اور ریچھوں سے بھرا پڑا ہوا ہے!

لازم تھا اب کہ ذوقِ تماشا کو دیکھتی
کب تک تمہاری آنکھ سے دُنیا کو دیکھتی

طوفان کے جلو میں مری بے بضاعتی
بستی کو دیکھتی کبھی دریا کو دیکھتی

بس دھوپ اور ریت ہے اور پیاس کا سفر
کیا دل کے سامنے کسی صحرا کو دیکھتی

اُس چشمِ سرد مہر کے سب رنگ دیکھ کر
کیا اشتیاقِ عرضِ تمنّا کو دیکھتی

اُس شہرِ بے نیاز میں جب تک رہا قیام
حسرت رہی کہ چشمِ شناسا کو دیکھتی

پھر چاکِ زندگی کو رفوگر ملا کہاں
جو زخم ایک بار کھُلا پھر سِلا کہاں

کل رات ایک گھر میں بڑی روشنی رہی
تارا مرے نصیب کا تھا اور کھِلا کہاں

اُتری ہے میری آنکھ میں خوابوں کی موتیا
ٹوٹے گا روشنی کا بھلا سِلسلہ کہاں

بِن عکس آئینے کا ہنر بھی نہ کھُل سکا
دُکھ کے بغیر قلب و نظر کو جِلا کہاں

ترکِ تعلقات کا کوئی سبب تو تھا
سننے کا میرے دل کو مگر حوصلہ کہاں

کچھ فیصلہ تو ہو کہ کدھر جانا چاہیئے
پانی کو اب تو سر سے گزر جانا چاہیئے

نشتر بدست شہر سے چارہ گری کی لو
اے زخمِ بے کسی تجھے بھر جانا چاہیئے

ہر بار ایڑیوں پہ گرا ہے مرا لہو
مقتل میں اب بہ طرزِ دگر جانا چاہیئے

کیا چل سکیں گے جن کا فقط مسئلہ یہ ہے
جانے سے پہلے رختِ سفر جانا چاہیئے

سارا جوار بھاٹا مرے دل میں ہے مگر
الزام یہ بھی چاند کے سر جانا چاہیئے

جب بھی گئے عذاب در و بام تھا وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیئے

تہمت لگا کے ماں پہ جو دشمن سے داد لے
ایسے سخن فروش کو مر جانا چاہیئے

خود کلامی

یوں لگتا ہے
جیسے میرے گرد و پیش کے لوگ
اِک اور ہی بولی بولتے ہیں
وہ ویولینتھ
جس پر میرا اور اُن کا رابطہ قائم تھا
کسی اور کرُے میں چلی گئی
یا میری لغت متروک ہُوئی
یا ان کا محاورہ اور ہُوا
مرے لفظ مجھے جس رستے پر لے جاتے ہیں

اُس رستے کے معنی کے لئے
اُن کی فرہنگ جُدا ہے
میں لفظوں کی تقدیس کی خاطر چپُ ہوں
اور میری ساری گفتگو
دیوار سے یا تنہائی سے یا اپنے سایے سے ممکن ہے
مجھے ڈر اُس پل سے لگتا ہے
جب خود میں سکڑتے سکڑتے
میں اپنے آپ سے باتیں کرنے والی
(رابطہ رکھنے والی)
فریکونسی بھی بھلا دوں
اور اِک دن
"مے ڈے، مے ڈے[1]" کرتی رہ جاؤں!

[1] MAY DAY

اِنکار

پروین شاکر

پروین قادر آغا
کے نام

ترتیب

نثری نظمیں

سج گئی بزمِ رنگ و نور ایک نگاہ کے لئے
بام پہ کوئی آگیا زینتِ ماہ کے لئے

فرشِ فلک پہ پاؤں رکھ، دیکھ تو کس طرح سے ہیں
تارے بچھے ہوئے تری چشمِ سیاہ کے لئے

دل میں یقینِ صبح کی لَو جو ذرا بلند ہو!
کافی ہے ایک ہی دیا شب کی سپاہ کے لئے

ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جو اے مرے شہریارِ حسن
آئے نہیں تری طرف منصب جاہ کے لئے

میری پھٹی ہوئی ردا دے بھی گئی بیاں مگر
فیصلہ رک گیا ہے ایک اور گواہ کے لئے

کیا ہوا گر نہیں نصیب میرے لباس کو رفو
طرۂ زرفشاں تو ہے تیری کُلاہ کے لئے

ہم بھی عجیب لوگ ہیں یا تو بہار گر ہیں یا
سارا چمن جلا دیا اک پرِکاہ کے لئے

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِ الہٰ کے لئے

سارے جہاں سے کٹ گئے، کتنے اکیلے رہ گئے
کس نے کہا تھا عمر بھر غم سے نباہ کے لئے

بابِ حیرت سے مجھے اِذنِ سفر ہونے کو ہے
تہنیت اَے دِل کہ اَب دیوار دَر ہونے کو ہے

کھول دیں زنجیرِ دَر اور حوض کو خالی کریں
زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دِل میں کیوں
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

گرد رہ بن کر کوئی حاصل سفر کا ہو گیا
خاک میں مل کر کوئی لعل و گہر ہونے کو ہے

اک چمک سی تو نظر آتی ہے اپنی خاک میں
مجھ پہ بھی شاید توجہ کی نظر ہونے کو ہے

گمشدہ بستی مسافر لوٹ کر آتے نہیں
معجزہ ایسا مگر بارِ دگر ہونے کو ہے

رونق بازار و محفل کم نہیں ہے آج بھی :
سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
اس سے اگلے موڑ کوئی ہمسفر ہونے کو ہے

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اِس خاک سے ہے

خواب میں بھی تجھے بھولوں تو روا رکھ مجھ سے
وُہ رویّہ جو ہوا کا خس و خاشاک سے ہے

بزمِ انجم میں قبا خاک کی پہنی میں نے
اور مری ساری فضیلت اسی پوشاک سے ہے

اتنی روشن ہے تری صبح کہ ہوتا ہے گماں
یہ اُجالا تو کسی دیدۂ نمناک سے ہے

ہاتھ تو کاٹ دیئے کوزہ گروں کے ہم نے
معجزے کی وُہی اُمید مگر چاک سے ہے

کچھ خبر لائی تو ہے بادِ بہاری اُسکی
شاید اس راہ سے گزرے گی سواری اُسکی

میرا چہرہ ہے فقط اُسکی نظر سے روشن
اور باقی جو ہے مضمون نگاری اُسکی

آنکھ اُٹھا کر جو رَوا دار نہ تھا دیکھنے کا
وُہی دِل کرتا ہے اب مِنّت و زاری اُسکی

رات کی آنکھ میں ہیں ہلکے گلابی ڈورے
نیند سے پلکیں ہُوئی جاتی ہیں بھاری اُسکی

اُس کے دربار میں حاضر ہوا یہ دِل اور پھر
دیکھنے والی تھی کچھ کارگزاری اُسکی

آج تو اُس پہ ٹھہرتی ہی نہ تھی آنکھ ذرا!
اُس کے جاتے ہی نظر میں نے اُتاری اُسکی

عرصۂ خواب میں رہنا ہے کہ لَوٹ آنا ہے
فیصلہ کرنے کی اِس بار ہے باری اُسکی

دیکھنے کا جسے کل رات میں ڈھنگ اور ہی تھا
صبح جب آئی تو اُس چشم کا رنگ اور ہی تھا

شیشۂ جاں کو مِرے اتنی ندامت سے نہ دیکھ
جس سے ٹوٹا ہے یہ آئینہ وہ سنگ اور ہی تھا

خلق کی یہ بھی ہوئی ساری ملامت اِک سمت
اُس کے لہجے میں چھُپا تیر و تفنگ اور ہی تھا

کیا غرض اِس سے کہ کس گوشۂ عزلت میں رہا
شمع کے آگے جب آیا تو پتنگ اور ہی تھا

لَو چراغوں کی بجھانے سے ذرا سا پہلے
میرے سردار کا اندازۂ جنگ اور ہی تھا

شام بھی روشن ہے کچھ جذبِ ذروں کی ضو بھی ہے
ساتھ اُس کے کوہ پر دیدارِ مہِ نو بھی ہے

اَبر ہے کہسار ہے اور دستِ شب میں منتظر
اُس لبِ لعلیں کے نام اِک جامِ آبِ جُو بھی ہے

پیرہن کی اِک جھلک سے بن معطر ہو گیا
جیسے موجِ رنگ میں خوشبو کی کوئی رَو بھی ہے

سطحِ دریا بڑھ رہی ہے اور ہوائے تند بھی
آج کی شب ہی بہت نیچی دِیے کی لَو بھی ہے

باغ کا حصّہ تو میں بھی ہوں مگر میرا وجُود
سبز بھی اِتنا نہیں ہے اور کچھ خود رَو بھی ہے

ایسا لگتا ہے کہ اِس دُنیا سے باہر بھی ہُوں مَیں
میرے چہرے میں کسی کے خواب کا پَرتو بھی ہے

شہ نشیں پر چاند اُترا، اِک پُرانی یاد کا
دل میں پرچم سا کھُلا کس قریۂ برباد کا

شہر پر اُس ساعتِ نا سعد کا سایہ ہے اب
جھٹپٹے کے وقت کیوں پتھر رکھا بنیاد کا

بستیوں کی گونج پُر اَسرار سی ہونے لگی
جیسے سنّاٹا پکارے شہرِ نا آباد کا

چہرہ کہسار کا دِکھلا گیا اِک اور رنگ
ثانیے بھر کے لئے دیدار برق و رعد کا

ایک اَن دیکھی خوشی رقصاں ہے برگ و بار میں
باغِ ہستی میں مرے موسم ہے ابر و باد کا

مَیں تو اُڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لئے
بھر گیا ہے دِل مگر مجھ سے مِرے صیّاد کا

شرارِ برق سے سارا جہان روشن تھا
عجیب طرح سے کل آسمان روشن تھا

ورائے چشم بھی اِک روشنی فضا میں تھی
کوئی مکان سے تا لا مکان روشن تھا

میں اُس کے ساتھ روانہ تھی کن فضاؤں کو
زمیں کا چہرہ فلک کے سمان روشن تھا

وصالِ رُوح و نظر کے عجیب لمحے میں
ہر ایک زاویۂ جسم و جان روشن تھا

فراق میں ہی رہے ہم تو ساری عُمر مگر
چراغ سا کوئی نزدیک جان روشن تھا

سپیدیٔ خطِ ساحل نظر میں تھی جب تک
مرا ستارہ، ترا بادبان روشن تھا

طلوعِ انجم و تکوینِ مہر سے پہلے
گُماں گزرتا ہے یہ خاکدان روشن تھا

ہوا مہک اٹھی، رنگ چمن بدلنے لگا
وہ میرے سامنے جب پیرہن بدلنے لگا

تبسم ہوئے ہیں تو اب گفتگو نہیں ہوتی
بیان حال میں طرزِ سخن بدلنے لگا

اندھیرے میں بھی مجھے جگمگا گیا ہے کوئی
بس اک نگاہ سے رنگ بدن بدلنے لگا

ذرا سی دیر کو بارش رکی تھی شاخوں پر
مزاج سوسن و سرو سمن بدلنے لگا

فرازِ کوہ پہ بجلی کچھ اس طرح چمکی
لباس وادی و دشت و دمن بدلنے لگا

تری نظر میں کہاں باریاب ہونا تھا
تمام عمر یہی اضطراب ہونا تھا

صبا چلی ہے جس نذرانے گلستاں میں
کسی کو لالہ، کسی کو گلاب ہونا تھا

بڑی امید تھی کارِ جہاں میں دل سے مگر
اُسے تو تیری طلب میں خراب ہونا تھا

سفر کی رات مسافر کی میزبانی کو
کوئی ستارہ، کوئی ماہتاب ہونا تھا

بس اتنی عمر تھی اُس سرزمینِ دل پہ مری
پھر اس کے بعد اسے دمِ خواب ہونا تھا

زندگی کوئے ملامت میں تو اب آئی ہے
اور کچھ چاہنے والوں کے سبب آئی ہے

ہم فقیروں میں کسی طور شکایت تیری
لب پہ آئی بھی تو تا حدِ ادب آئی ہے

پھول سے کھِلتے چلے جاتے ہیں جیسے دل میں
اِس گلستاں میں عجب موجِ طرب آئی ہے

میری پوشاک میں تارے سے اچانک چمکے
کس کے آنگن سے یہ جوتی ہوئی شب آئی ہے

کس سے پُوچھوں پسِ دیوارِ چمن کیا گزری
میرے گھر میں تو ہوا مُہر بہ لب آئی ہے

کون سے پھُول کھِلے تھے کل رات ترے بستر پر
آج خوشبُو ترے پہلو سے عجب آئی ہے

حیراں ہجومِ رنگ میں یہ چشم کب سے ہے
اس باغ میں بہار کسی کے سبب سے ہے

کب شکوۂ تغافل و بیداد سب سے ہے
تجھ سے گلہ ہے اور نہایت ادب سے ہے

ہر شے میں حسن اُس کے مقابل سے آنے کا
مہتاب کا جمال بھی زنگارِ شب سے ہے

یہ عشق ہے اور اس میں سرافرازی و کمال
رخسار و خال و خط سے نہ نام و نسب سے ہے

اس دل میں شوقِ دید زیادہ ہی ہو گیا
اُس آنکھ میں مرے لئے انکار جب سے ہے

ایک اُداس نظم

یہ حسین شام اپنی
ابھی جس میں گھل رہی ہے
ترے پیرہن کی خوشبو
ابھی جس میں کھل رہے ہیں
مرے خواب کے شگوفے
ذرا دیر کا ہے منظر!

ذرا دیر میں افق پہ
کھلے گا کوئی ستارہ
تری سمت دیکھ کر وہ
کرے گا کوئی اشارہ
ترے دل کو آئے گا پھر
کسی یاد کا بلاوا
کوئی قصۂ جدائی

کوئی کارِ نامکمل
کوئی خوابِ ناشگفتہ
کوئی بات کہنے والی
کسی اور آدمی سے!

ہمیں چاہیئے تھا ملنا
کسی عہدِ مہرباں میں
کسی خوابِ یقیں میں
کسی اور آسماں پر
کسی اور سرزمیں میں!

فیض کے فراق میں

تہہِ خاک

کیسا چراغ وقت نے رکھ دیا

کہ سیاہ پوش ہوئی ہوا

کفِ دست بادہ بات سے پھول یہ کیا گرا

چمنِ نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں

ہمہ شہر راہ میں اور نگار کہیں نہیں

پُلِ سبز پر کوئی نجمِ راہ فروز اب نہیں خیمہ کش

وُہ غبار اُٹھا ہے کہ سُوجھتا نہیں راستہ

مرے ماہتاب کہاں ہے تُو

کوئی اور بھی ہے نظامِ مہر و نجوم جس کو رواں ہے تُو

ترے فرشِ نیلوفری پہ کون سے بُرج کی یہ کشش بڑھی

کہ طلسمِ خانۂ ہست میں تری روشنی کا قیام اتنا لکھا گیا

مرے نَے نواز

قبائے ساز ترے فراق میں چاک ہے

وہ سکوت شہرِ سخن میں ہے
کہ صدائے گریۂ شبنمِ شبِ تار دل کو سنائی دے
تہِ ہفت حجلۂ نور ایک ہی خواب ہے
کوئی معجزہ ہو کہ شکل تیری دکھائی دے !
کوئی سلسلہ ہو کہ راز پھر سے سجھائی دے !

تیری خوشبو کا پتا کرتی ہے
مجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے

چوم کر پھول کو آہستہ سے
معجزہ بادِ صبا کرتی ہے

کھول کر بندِ قبا، گُل کے ہوا
آج خوشبو کو رِہا کرتی ہے

ابر برسے تو عنایت اُسکی
شاخ تو صرف دعا کرتی ہے

زندگی پھر سے فضا میں روشن
مشعلِ برگِ حنا کرتی ہے

ہم نے دیکھی ہے وہ اجلی ساعت
رات جب شعر کہا کرتی ہے

شب کی تنہائی میں اب تو اکثر
گفتگو تجھ سے رہا کرتی ہے

دل کو اُس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جُدا کرتی ہے

زندگی میری تھی لیکن اب تو
تیرے کہنے میں رَہا کرتی ہے

اُس نے دیکھا ہی نہیں ورنہ یہ آنکھ
دِل کا احوال کہا کرتی ہے

مصحفِ دل پہ عجب رنگوں میں
ایک تصویر بنا کرتی ہے

بے نیازِ کفِ دریا انگشت
ریت پر نام لکھا کرتی ہے

دیکھ تو آن کے چہرہ میرا
اِک نظر بھی تری کیا کرتی ہے

زندگی بھر کی یہ تاخیر اپنی
رنج ملنے کا سوا کرتی ہے

شام پڑتے ہی کسی شخص کی یاد
کوچۂ جاں میں صدا کرتی ہے

مسئلہ جب بھی چراغوں کا اُٹھا
فیصلہ صرف ہوا کرتی ہے

ق

مجھ سے بھی اس کا ہے ویسا ہی سلوک
حال جو تیرا انا کرتی ہے

دُکھ ہُوا کرتا ہے کچھ اور بیاں
بات کچھ اور ہُوا کرتی ہے

اک ہُنر تھا، کمال تھا کیا تھا
مجھ میں تیرا جمال تھا کیا تھا

تیرے جانے پہ اب کے کچھ نہ کہا
دل میں ڈر تھا، ملال تھا کیا تھا

برق نے مجھ کو کر دیا روشن
تیرا عکسِ جلال تھا کیا تھا

ہم تک آیا تو مہرِ لطف و کرم
تیرا وقت زوال تھا کیا تھا

جس نے تہہ سے مجھے اُچھال دیا
ڈوبنے کا خیال تھا کیا تھا

جس پہ دِل سارے عہد بھول گیا
بھُولنے کا سوال تھا کیا تھا

تتلیاں تھے ہم اور قضا کے پاس
سُرخ پھولوں کا جال تھا کیا تھا

اے رنج بھری شام

دہلیزِ سماعت پہ کسی وعدے کی آہٹ
اُترے کہ نہ اُترے
اے رنج بھری شام !
دُکھتے ہُوئے دل پر
کوئی آہستہ سے آکر
اک حرفِ تسلّی تو رکھے پھُول کی مانند !

ایک پیغام

وہی موسم ہے
بارش کی ہنسی
پیڑوں میں چھن چھن گونجتی ہے
ہری شاخیں
سنہری پھول کے زیور پہن کر
تصوّر میں کسی کے مسکراتی ہیں
ہوا کی اوڑھنی کا رنگ پھر ہلکا گلابی ہے
شناسا باغ کو جاتا ہوا خوشبو بھرا رستہ
ہماری راہ تکتا ہے
طلوعِ ماہ کی ساعت
ہماری منتظر ہے

وہ کیسی، کہاں کی زندگی تھی
جو تیرے بغیر کٹ رہی تھی

اُس کو جب پہلی بار دیکھا
میں تو حیران رہ گئی تھی

وہ چشم تھی سحرکارِ بے حد
اور مجھ پہ طلسم کر رہی تھی

لوٹا ہے وہ پچھلے موسموں کو
مجھ میں کسی رنگ کی کمی تھی

صحرا کی طرح تھیں خشک آنکھیں
بارش کہیں دل میں ہو رہی تھی

آنسو مرے چومتا تھا کوئی
دُکھ کا حاصل یہی گھڑی تھی

سنتی ہوں کہ میرے تذکرے پر
ہلکی سی اُس آنکھ میں نمی تھی

غربت کے بہت کڑے دنوں میں
اُس دل نے مجھے پناہ دی تھی

سب گرد تھے اُس کے اور ہم نے
بس دُور سے اک نگاہ کی تھی

تیرے اُجالے کیا کسی اور دیار بس گئے
اے مرے ماہِ نیم ماہ لوگ تجھے ترس گئے

تیرے کرم کی دھوپ تو خیر کسے نصیب تھی
تیرے ستم کے ابر بھی اور کہیں برس گئے

تیری رضا کے سامنے اب ہمیں دیکھنا ہے کیا
عشق کے امتحان میں ذہن کے پیش و پس گئے

ساری فضا نے حرف دعوت عطر مزاج ہو گئی
بزم سخن سے ہو کے آج کیسے حنا نفس گئے

کیا انہیں میری خاک سے بوئے رفاقت آئی تھی
اُس کی گلی میں دُور تک کیسے یہ خار دخس گئے

ہم نے ہی لوٹنے کا ارادہ نہیں کیا
اُس نے بھی بھول جانے کا وعدہ نہیں کیا

دُکھ اوڑھتے نہیں کبھی جشنِ طرب میں ہم
ملبوسِ دل کو تن کا لبادہ نہیں کیا

جو غم ملا ہے بوجھ اٹھایا ہے اُس کا خود
سر زیرِ بارِ ساغر و بادہ نہیں کیا

کارِ جہاں ہمیں بھی بہت تھے سفر کی شام
اُس نے بھی التفات زیادہ نہیں کیا

آمد پہ تیری عطر و چراغ و سبو نہ ہوں
اتنا بھی بود و باش کو سادہ نہیں کیا

اِس بار تو اپنے پاس تھے ہم
پھر کس کے لیے اُداس تھے ہم

آتی تھی ہمیں رفوگری بھی
اِک دُوسرے کا لباس تھے ہم

کچلے گئے جب بھی سر اُٹھایا
فٹ پاتھ کی ایسی گھاس تھے ہم

ممنوع قرار پا گئے ہیں :
جس بزم میں حرفِ خاص تھے ہم

چلتے رہے نبر ہوا کے آگے
کیا جانیے کس کی آس تھے ہم

کھلا ہے آج دلِ لالہ فام کس کے لئے
وُہ جا چکا ہے تو آئی ہے شام کس کے لئے

جو پھُول کھلنے تھے وُہ راکھ ہو چکے ہوں گے
نسیمِ صبح کو اب اذنِ عام کس کے لئے

وُہ گل عذار نہیں ہو گا اب چمن آرا
صبا کے ہاتھ سلام و پیام کس کے لئے

وُہ مے گسار تو لے بادِ نو بہار گیا
شرابِ سُرخ سے بھرتی ہے جام کس کے لئے

بہت سے لوگ تھے مہمان میرے گھر لیکن
وُہ جانتا تھا کہ ہے اہتمام کس کے لئے

ایک دفنائی ہوئی آواز

پھولوں اور کتابوں سے آراستہ گھر ہے
تن کی ہر آسائش دینے والا ساتھی
آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا بچہ
لیکن اس آسائش، اس ٹھنڈک کے رنگ محل میں
جہاں کہیں جاتی ہوں
بنیادوں میں بے حد گہری چُنی ہوئی
اک آواز برابر گریہ کرتی ہے
مجھے نکالو!
مجھے نکالو!

مُراد

بھیڑیے !
میرے چاروں طرف بھیڑیے
آنکھیں حلقوں سے باہر
زبانیں بھی نکلی ہوئی
دھونکنی کی طرح سانس چلتی ہوئی
میرے اطراف حلقہ کئے
میری یک لمحے کی غفلت کے یوں منتظر
جس طرح کوئی ماہر شکاری
دانہ و دام بھی
سنگ الزام بھی
جاہ و انعام بھی
جال حاضر ہے ہر شکل کا !

پر مرے گرد
ایسا الاؤ ہے روشن
کہ ہر حیلہ و مکر کے باوجود
یہ درندے
فاصلے کو نبھانے پہ مجبور ہیں
بھیڑیے آگ میں پاؤں رکھتے نہیں !

شرارت سے بھری آنکھیں

ستاروں کی طرح سے جگمگاتی ہیں
شرارت سے بھری آنکھیں!

مرے گھر میں اُجالا بھر گیا
تیری ہنسی کا
یہ ننھے ہاتھ جو گھر کی کوئی شے
اب کسی ترتیب میں رہنے نہیں دیتے
کوئی سامانِ آرائش نہیں اپنی جگہ پر اب
کوئی کیاری سلامت ہے
نہ کوئی پھول باقی
یہ مٹی میں سنے پاؤں
جو میری خواب گہ کی دودھیا چادر کا ایسا حال کرتے ہیں
کہ کچھ لمحے گزرنے پر ہی پہچانی نہیں جاتی
مگر میری جبیں پر بل نہیں آتا

کبھی رنگوں کی پچکاری سے
سرتاپا بھگو دینا

کبھی چُنری چھپا دینا
کبھی آنا عقب سے
اور مری آنکھوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر
پُوچھنا تیرا
بھلا میں کون ہُوں
بوجھیں تو جانوں!

میں تجھ سے کیا کہوں
تو کون ہے میرا
مرے نٹ کھٹ کنہیا!
مجھے تو علم ہے اتنا
کہ یہ بے نظم اور ناصاف گھر
میری توازن گر طبیعت پر
گراں بننے نہیں پاتا
اگر تو میرے آنگن میں نہ ہوتا
تو میرے خانۂ آئینہ ساماں میں
بہ ایں ترتیب و آرائش
اندھیرا ہی رہا کرتا!

سفر اَب جتنا باقی ہے....

بہت سردی ہے — مما
ابھی کچھ دیر
میرا ہاتھ مت چھوڑیں !

زمستاں کی ہوا سے کپکپاتا
میرے سینے سے لگا
تُو کہہ رہا تھا !

زیادہ دن نہیں گزرے
کہ میری گود کی گرمی
تجھے آرام دیتی تھی
گلے میں میرے بانہیں ڈال کر تو اس طرح سوتا
کہ اکثر ساری ساری رات میری
ایک کروٹ میں گزر جاتی !

مرے دامن کو پکڑے
گھر میں تتلی کی طرح سے گھومتا پھرتا
مگر پھر جلد ہی تجھ کو

پرندوں اور پھولوں

اور پھر ہمجولیوں کے پاس سے ایسا بلاوا آ گیا کہ

میری انگلی چھڑا کر

تو ہجومِ رنگ میں خوشبو کی صورت مل گیا تھا

پھر اس کے بعد

خوابوں سے بھرا بستہ لئے

اسکول کی جانب روانہ ہو گیا تو

جہاں پر رنگ اور کچھ حرف اور پھر بند سے

اور سو طرح کے کھیل تیرے منتظر تھے

دل لبھاتے تھے

ترے اُستاد مجھ سے معتبر تھے

دوست مجھ سے خوب تر تھے

مجھے معلوم ہے

میں تجھ سے پیچھے رہ گئی ہوں

سفر اب جتنا باقی ہے

وہ بس پسپائی کا ہی رہ گیا ہے

تری دنیا میں اب ہر پل

نئے لوگوں کی آمد ہے

میں بے حد خامشی سے

ان کی جگہیں خالی کرتی جا رہی ہوں
ترا چہرہ نکھرتا جا رہا ہے
میں پس منظر میں ہوتی جا رہی ہوں!

زیادہ دن نہ گذریں گے
مرے ہاتھوں کی یہ دھیمی حرارت
تجھے کافی نہیں ہوگی
کوئی خوش لمس دست یاسمیں آکر
گلابی رنگ حدت
تیرے ہاتھوں میں سمو دے گا
مرا دل تجھ کو کھو دے گا
میں باقی عمر
تیرا راستہ تکتی رہوں گی
میں ماں ہوں
اور مری قسمت جدائی ہے!

اپنے بیٹے کیلئے ایک نظم

میرے بچے نے پہلی بار اٹھایا ہے قلم
اور پوچھتا ہے
کیا لکھوں ممّا؟

میں تجھ سے کیا کہوں بیٹے
کہ اب سے برسوں پہلے
یہ لمحہ جب مری ہستی میں آیا تھا
تو میرے باپ نے مجھ کو سکھائے تھے
محبت، نیکی اور سچائی کے کلمے
مرے توشے میں ان لفظوں کی پونجی رکھ کے وہ سمجھا تھا
میرا راستہ کٹ جائیگا
آگے سفر آسان ہو جائے گا شاید!
محبت مجھ سے دنیا نے وصولی
قرض کی مانند
نیکی سود کی صورت میں
حاصل کی

مری سچائی کے سکّے
ہُوئے رد اس طرح سے
کہ میں فوراً سنبھلنے کی نہ کوئی تدبیر کرتی
تو سر پہ چھت نہ رہتی
تن پہ پیراہن نہیں بچتا
میں اپنے گھر میں رہ کر
عمر بھر جزیہ ادا کرتی رہی ہوں!

زمانہ

میرے خدشوں سے سوا عیّار تھا
اور زندگی
میری توقع سے زیادہ بے مروّت تھی
تعلّق کے گھنے جنگل میں
بچھو سرسراتے تھے
مگر ہم اس کو سرشاری میں
فصلِ گُل کی سرگوشی سمجھتے تھے
پتہ ہی کچھ نہ چلتا تھا
کہ خوابوں کی چھپر کھٹ پر
لباسِ ریشمیں
کس وقت بن کر کینچلی اترا

مخاطب کے رد پہلے دانت
کب بِلمے ہوئے
اور کان
کب پیچھے مُڑے
اور پاؤں
کب غائب ہُوئے یکدم :

میں اِس کذب و ریا
اِس بے لحاظی سے بھری دُنیا میں رہ کر
محبت اور نیکی اور سچائی کا ورثہ
تجھ کو کیسے منتقل کر دوں
مجھے کیا دے دیا اُس نے !

مگر میں ماں ہوں
اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے
تو دُنیا ختم ہو جائے
سو میرے خوش گماں بچے !
تو اپنی لوحِ آئندہ پہ
سارے خوبصورت لفظ لکھنا

احسان کرنا
پیار بھی کرنا
مگر آنکھیں کھُلی رکھنا !

جُدائی کی پہلی رات

آنکھ بوجھل ہے
مگر نیند نہیں آتی ہے
میری گردن میں حمائل تری بانہیں جو نہیں
کسی کروٹ بھی مجھے چین نہیں پڑتا ہے
سرد پڑتی ہُوئی رات
مانگنے آئی ہے پھر مجھ سے
ترے نرم بدن کی گرمی
اور دریچوں سے جھجکتی ہُوئی آہستہ ہوا
کھوجتی ہے مرے غم خانے میں
تیری سانسوں کی گلابی خوشبو!

میرا بستر ہی نہیں
دل بھی بہت خالی ہے
اِک خلا ہے کہ مری رُوح میں دہشت کی طرح اُترا ہے
تیرا ننھا سا وجود
کیسے اُس نے مجھے بھر رکھا تھا

ترے ہوتے ہوئے دُنیا سے تعلق کی ضرورت ہی نہ تھی
ساری وابستگیاں تجھ سے تھیں
تُو مری سوچ بھی، تصویر بھی اور بولی بھی
میں تری ماں بھی، تری دوست بھی، ہمجولی بھی
تیرے جانے پہ کھُلا
لفظ ہی کوئی مجھے یاد نہیں
بات کرنا ہی مجھے بھُول گیا!
تُو مری رُوح کا حصّہ تھا
مرے چاروں طرف
چاند کی طرح سے رقصاں تھا مگر
کس قدر جلد تری ہستی نے
مرے اطراف میں سُورج کی جگہ لے لی ہے
اب ترے گرد میں رقصندہ ہوں!
وقت کا فیصلہ تھا
ترے فردا کی رفاقت کے لئے
میرا امروز اکیلا رہ جائے
مرے بچّے، مرے لال
فرض تو مجھ کو نبھانا ہے مگر
دیکھ کہ کتنی اکیلی ہوں میں!

بیٹھی ہے بال کھولے ہُوئے میرے پاس شب
آئی ہے کون شہر سے اتنی اُداس شب

میں چُپ رہی تو رات نے بھی ہونٹ سی لئے
میں اس کا پیرہن ہوں تو میرا لباس شب

گھر جلد لوٹ کر بھی تو منظر وہی رہا
ویسی ہی سرد شام وہی نا سپاس شب

شاید کہ کل کی صبح قیامت ہی بن کے آئے
اُتری ہے جسم و جان پہ بن کر ہراس شب

سُورج کو دیکھنے کا سلیقہ کہاں ہمیں:
جب بھی نظر اُٹھائی، رہی آس پاس شب

اے ماہ و مہرِ حُسن، ترے عہد میں کبھی
دن ہی ہمیں خوش آئے نہ آئی ہے راس شب

مدّت کے بعد چاند نے دستک بدن پہ دی
پھر حجلۂ حیات میں آئی ہے خاص شب

نظر کے سامنے اک راستہ ضروری ہے
بھٹکتے رہنے کا بھی سلسلہ ضروری ہے

مثالِ ابر و ہوا دل بہم رہیں لیکن
محبتوں میں ذرا فاصلہ ضروری ہے

وہ خوف ہے کہ سرِ شام گھر سے چلتے وقت
گلی کا دور تلک جائزہ ضروری ہے

ملے اس آنکھ کو بھی تیرے خواب کی اجرت
چراغِ کشتہ کو اتنا صلہ ضروری ہے

نجانے فیصلہ باقی کہ اختلاف رہے
کنارِ متن کوئی حاشیہ ضروری ہے

تعلقات کے نامعتبر حوالوں میں
تمام عمر کا اِک رابطہ ضروری ہے

اَب اور جینے کی صورت نظر نہیں آتی
کسی طرف سے بھی اچھی خبر نہیں آتی

اُسی کے آس میں ہے دل کا حجرہ تاریک
وہ روشنی جو کبھی میرے گھر نہیں آتی

وُہ مہرباں ہے تو محرابِ بام تک نہ رہے
یہ دھوپ کیوں پسِ دیوار و در نہیں آتی

رہِ حیات میں اب کوئی ایسا موڑ نہیں
کہ جس کے بعد تری رہگذر نہیں آتی

قبولیت کی ہے ساعت تو اُسکو مانگ ہی لیں
کہ یہ گھڑی کبھی بارِ دگر نہیں آتی

سرائے خانۂ دُنیا میں شام ہوتی ہے
مسافروں کو نویدِ سفر نہیں آتی

پھر ایک بار تجھی سے سوال کرنا ہے
نگاہ میں ترا منصب بحال کرنا ہے

لہو سے سینچ دیا اور پھر یہ طے پایا
اسی گلاب کو اب پائمال کرنا ہے

اس ایک مرہمِ نوروز و لمسِ تازہ سے
پرانے زخموں کا بھی اندمال کرنا ہے

یہ غم ہے اور ملا ہے کسی کے در سے ہمیں
سو اس شجر کی بہت دیکھ بھال کرنا ہے

بھلا کے وہ ہمیں حیران ہے تو کیا کہ ابھی
اسی طرح کا ہمیں بھی کمال کرنا ہے

مقتلِ وقت میں خاموش گواہی کی طرح
دل بھی کام آیا ہے گمنام سپاہی کی طرح

ایک لمحے کو زمانے نے رضا پوچھی تھی
گفتگو ہونے لگی ظلِ الٰہی کی طرح

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی حمایت ٹھہرا
خامشی بھی تو ہوئی پشت پناہی کی طرح

اُس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

کشمکش ایک دیا اور ہوا کی اقلیم
پھیلتی جائے مقدر کی سیاہی کی طرح

پھیلا ہُوا ہے حدِ بصارت میں نُور کیا
مہتاب نے کیا مرے اندر ظہُور کیا

خود پھُول کی طرح مجھے کھِلنے کا شوق تھا
اب تیز ہے ہَوا تو ہَوا کا قصُور کیا

اِک نقش موجِ آبِ رواں پر بنا ہوا
ایسے ہنر پہ فکرِ سخن کا غرُور کیا

جب آمدِ بہار کا امکان ہی نہیں
پھر نغمہ سنج ہوں گے فضا میں طیور کیا

ہر چیز فاصلے پہ نظر آئی ہے مجھے
اِک شخص زندگی میں ہُوا مجھ سے دُور کیا

سب خیریت کا سُن کے بدن سرد پڑ گئے
کِس کو نہیں خبر کہ ہے بین السطور کیا

تکریم زندگی سے بھی اب دست کش ہیں ہم
اس سے زیادہ نذر گزاریں حضُور کیا

چھاؤں رزق آئے ہیں یوں نقص سے مجبور ہوئے
وہ جو تقسیمِ ثمر پہ یہاں مامور ہوئے

شعبۂ رزق خدا نے جو رکھا اپنے پاس
نائب اللہ بہت بددل و رنجور ہوئے

وہی شداد، وہی جنتِ خاشاک نہاد
ویسے ہی ظلمتِ یک لحظہ پہ مغرور ہوئے

وہ رعونت ہے کہ لگتا ہے ازل سے ہیں یونہی
نشۂ مسندِ شاہانہ سے مخمور ہوئے

اپنی تقویم میں اب منظرِ فردا تو نہیں
عکسِ معزول سے کچھ اس طرح مسحور ہوئے

ہم وہ شہزادۂ سیہ بخت کہ دشمن کی بجائے
اپنے لشکر کے سبب شہر میں محصور ہوئے

اب تو بس خواب کی بیساکھی پہ چلنا ہوگا
مدتیں ہو گئیں اس آنکھ کو معذور ہوئے

نشاطِ غم

دسمبر کا کوئی یخ بستہ دن تھا
میں یورپ کے نہایت دُور افتادہ علاقے کی
کسی ویران طیراں گاہ میں
بالکل اکیلی بنچ پر بیٹھی تھی
اعلانِ سفر کی منتظر تھی
جہاں تک آنکھ شیشے کے اُدھر جاتی
اُداسی سے گلے ملتی
مسلسل برفباری ہو رہی تھی !

اچانک میں نے اپنے سے مخاطب
بہت مانوس سی آواز دیکھی
"آپ کیسی ہیں ؟
اکیلی ہیں ؟
گھنے بالوں چمکتی بھوری آنکھوں
دلنشیں باتوں سے پُر

وہ پُرکشش لڑکا کہاں ہے ؟
آپ دونوں ساتھ کتنے اچھے لگتے تھے !"

ـس چہرے پہ اک سایہ سا لہرایا تھا شاید
وہ آگے کچھ نہیں بولا !

میرا دل دُکھ سے کیسا بھر گیا تھا
مگر تہہ میں خوشی کی لہر بھی تھی
پُرانے لوگ ابھی بھولے نہیں ہم کو
ہمیں بچھڑے، اگرچہ
آج سولہ سال تو ہونے کو آئے !

وہ ہم نہیں جنہیں سہنا یہ جبر آ جاتا
تری جدائی میں کس طرح صبر آ جاتا

فصیلیں توڑ نہ دیتے جو اب کے اہلِ قفس
تو اور طرح کا اعلانِ جبر آ جاتا

وہ فاصلہ تھا دُعا اور مستجابی میں
کہ دُھوپ مانگنے جاتے تو ابر آ جاتا

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

وزیر و شاہ بھی خس خانوں سے نکل آتے
اگر گمان میں انگارِ قبر آ جاتا

اُس سے ملنا ہی نہیں' دل میں تہیّہ کرلیں
وہ خود آئے تو بہت سرد رویّہ کرلیں

ایک ہی بار یہ گھر راکھ ہو' جاں تو چھُوٹے
آگ کم ہے تو ہَوا اور مہیّا کرلیں

کیا ضمانت ہے کہ وُہ چاند اُتر آئے گا
تارِ مژگاں کو اگر عقدِ ثریّا کرلیں

سانس اُکھڑ جاتا ہے اب وقت کی ہم گامی میں
جی میں آتا ہے کہ ہم پاؤں کو پہیّہ کرلیں

کوئی پوُچھے کہ زباں کیا ہے تری تو پروینؔ
وقت ایسا ہے کہ بہتر ہے تقیّہ کرلیں

حبس بہت ہے

حبس بہت ہے
اشکوں سے یوں آنچل گیلے کرکے ہم
دل پر کب تک ہوا کریں
باغ کے دَر پہ قفل پڑا ہے
اور خوشبو کے ہاتھ بندھے ہیں
کیسے صدا دیں
لفظ سے معنی بچھڑ چکے ہیں
لوگ پرانے اُجڑ چکے ہیں
نابینا قانون وطن میں جاری ہے
آنکھیں رکھنا
جرمِ قبیح ہے
قابلِ دست اندازیٔ حاکمِ اعلیٰ ہے!
حبس بہت ہے!

بہت دِل چاہتا ہے

بہت دل چاہتا ہے
کسی دِن غاصبوں کے نام لکھوں ایک کھُلا خط
لکھوں اس میں
کہ تم نے چور دروازے سے آکر
مرے گھر کا تقدّس
جس طرح پامال کر کے
توشہ خانے کو تصرّف میں لیا ہے
تمہاری تربیت میں یہ روّیہ
دشمنوں کے ساتھ بھی زیبا نہیں تھا!
کلامِ فتح میں بھی
یہ سخن شامل نہیں تھا!
یہاں تک بھی غنیمت تھا،
تمہارے پیش رَو، بخت آزمائی میں
زر و سیم و جواہر تک نظر محدُود رکھتے تھے
جوانوں کو تہہِ تلوار کرتے

مگر ماؤں کی چادر
بیٹیوں کی مسکراہٹ
اور بچوں کے کھلونوں سے
تعرض کچھ نہ کرتے
مگر تم نے تو حد کردی
نہ بیت المال ہی چھوڑا
نہ بیوہ کی جمع پونجی
اور اب تم نے
ہماری سوچ کو بھی
راجدھانی کا کوئی حصہ بنانے کا ارادہ کر لیا ہے
ہمارے خواب کی عصمت پہ نظریں ہیں :
قلم کا چھیننا
آساں نہیں ہے !
یہ درویشوں کی بستی ہے
دبے پاؤں بھی یاں آنے کی تم جرات نہیں کرنا
کرائے پر
قصیدہ خواں اگر کچھ مل بھی جائیں تو
قبیلے کے کسی سردار کی بیعت نہیں ملتی
ہمارے آخری ساتھی کی تکمیل شہادت تک
تمہیں نصرت نہیں ملنی !

چیلنج

حاکمِ شہر کے ہرکارے نے
آدھی رات کے سناٹے میں
میرے گھر کے دروازے پر
دستک دی ہے
اور فرمان سنایا ہے
"آج کے بعد سے
ملک سے باہر جانے کے سب رستے، خود پر بند سمجھنا
تم نے غلط نظمیں لکھی ہیں"

اے۔ایس۔آئی سے کیا شکوہ
اُس نے اپنا ذہن کرائے پہ دے رکھا ہے
وہ کیا جانے
مٹی کی خوشبو کیا ہے
ارضِ وطن کے رُخ سے بڑھ کر
آنکھوں کی راحت کیا ہے
حاکمِ وقت کی نظروں میں

میری وفاداری مشکوک ہی ٹھہری تو
مجھ کو کچھ پرواہ نہیں
جس مٹی نے مجھ کو جنم دیا ہے
میرے اندر شعر کے پھول کھلائے ہیں
وُہ اس خوشبو سے واقف ہے
اس کو خبر ہے
فصلِ خزاں کو فصلِ خزاں کہنے کا مطلب
گلشن سے غداری نہیں ہے
اور اگر ایسا ٹھہرا تو
حاکمِ وقت کے ہرکارے
مجھ پر فردِ جُرم لگائیں
خاکِ وطن کو حَکَم بنائیں !

۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کے لئے ایک دُعا

اے خدا !

میرے پیارے سپاہی کی تلوار میں زنگ لگنے لگا ہے

اذانوں سے پہلے جو بیدار ہوتے تھے

اب دن چڑھے تک

چھپر کھٹ سے نیچے اُترتے نہیں

دھوپ اگر سخت ہو جائے

بارش ذرا تیز ہو جائے تو

یہ جواں سال

گھر سے نکلتے نہیں

سرحدوں کے نگہبان اب کرسیوں کے طلبگار ہیں

اپنے آقا کے دربار میں

جنبش چشم و ابرو کی پیہم تلاوت میں مصروف ہیں

سر خمیدہ ہیں

شانے بھی آگے کو نکلے ہوئے

بس نصابِ تملق کی تکمیل میں منہمک !

میرا دل رو پڑا ہے

اے خدا !

میرے پیارے وطن پر یہ کیسی کھڑی ہے ،
تراشے ہُوئے جسم
آسائشوں میں پڑے
اپنی رعنائیاں کھو رہے ہیں
ذہن کی ساری یکسوئی مفقود ہے
اہلِ طبل و علَم
اہلِ جاہ و حشَم بن رہے ہیں
اور اِس بات پر
دیکھتی ہُوں کہ مغرور ہیں !

اے خدا !

میرے پیارے سپاہی کو سرحد کا رستہ دکھا
عشقِ اموال و حُبِّ مناصب سے باہر نکال
اس کے ہاتھوں میں
بھُولی ہُوئی تیغ پھر سے تھما !

صیّاد تو امکانِ سفر کاٹ رہا ہے
اندر سے بھی کوئی مرے پَر کاٹ رہا ہے

اے چادرِ منصب، ترا شوقِ گُلِ تازہ
شاعر کا ترے دستِ ہنر کاٹ رہا ہے

جس دن سے شمار اپنا پنہ گیروں میں ٹھہرا
اُس دن سے تو لگتا ہے کہ گھر کاٹ رہا ہے

کس شخص کا دِل میں نے دُکھایا تھا کہ اب تک
وُہ میری دعاؤں کا اثر کاٹ رہا ہے

قاتل کو کوئی قتل کے آداب سکھانے
دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

اگرچہ تجھ سے بہت اختلاف بھی نہ ہوا
مگر یہ دل تری جانب سے صاف بھی نہ ہوا

تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا اور خلاف بھی نہ ہوا

عجب تھا جرمِ محبت کہ جس پہ دل نے مرے
سزا بھی پائی نہیں اور معاف بھی نہ ہوا

ملامتوں میں کہاں سانس لے سکیں گے وہ لوگ
کہ جن سے کوئے جفا کا طواف بھی نہ ہوا

عجب نہیں ہے کہ دل پر جمی ملی کائی
بہت دنوں سے تو یہ حوض صاف بھی نہ ہوا

ہوائے دہر ! ہمیں کس لئے بجھاتی ہے
ہمیں تو تجھ سے کبھی اختلاف بھی نہ ہوا

رستے میں مل گیا تو شریکِ سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہو اُسے اپنا گھر نہ جان

تنہا ہوں اس لیے نہیں جنگل سے بھی مفر
اے میرے خوش گماں مجھے اتنا نڈر نہ جان

ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ !
اس شہرِ بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

یاں اک محل تھا آگے زر و سیم سے بنا
اے خوش خرام ! دل کو ہمارے کھنڈر نہ جان

دکھ سے بھری ہے لیک میسر تو ہے حیات
اس رنج کے سفر کو بھی بارِ دگر نہ جان

اِسی میں خوش ہوں مرا دُکھ کوئی تو سہتا ہے
چلی چلوں گی جہاں تک یہ ساتھ رہتا ہے

زمینِ دل یونہی شاداب تو نہیں اَے دوست
قریب میں کوئی دَریا ضرُور بہتا ہے

گھنے درختوں کے گرنے پہ ماسوائے ہوا !
عذابِ دَر بَدری اور کون سہتا ہے

نجانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے

مقامِ دل کہیں آبادیوں سے ہے باہر
اور اِس مکان میں جیسے کہ کوئی رہتا ہے

مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی :
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

ثنائے انجم و تسبیحِ کہکشاں کے لئے
یہ وہ زمیں ہے بنی تھی جو آسماں کے لئے

سفر کے باب میں کتنے عجیب لوگ ہیں ہم
کہاں کا قصد کیا چل پڑے کہاں کے لئے

ہوا کا زور کسی شب تو جا کے ٹوٹے گا
بچائے رکھنا ہے کوئی دیا مکاں کے لئے

فضا میں دھند بہت بڑھ گئی ہے جب کوئی چشم
ستارہ بننے لگی میرے بادباں کے لئے

شرارِ برق نہ زحمت کرے توجہ کی
بہت سی آگ میسر ہے آشیاں کے لئے

سفید پوشیٔ دیوار و در نہ کھل جائے
بجھا دیئے ہیں چراغ اب تو میہماں کے لئے

فسانہ اپنا کسی اور باب میں ہے رقم
ہے انتخاب کسی اور داستاں کے لئے

ہوا پہ لکھا ہوا حرف ہی سہی دنیا
تمام رنگ اسی نقشِ رائیگاں کے لئے

کچھ دیر میں تجھ سے کٹ گئی تھی
محور سے زمین ہٹ گئی تھی

تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمل
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی تھی

شاید کہ ہمیں سنوار دیتی
جو شب آ کر پلٹ گئی تھی

رستہ تھا وہی پہ بن تمہارے
میں گرد میں کیسی اٹ گئی تھی

پت جھڑ کی گھڑی تھی اور شجر سے
اک بیل عجب لپٹ گئی تھی

یوں وحشتِ رخصت میں نہ اس دل کو رکھا جائے
جانا ہے کسی کو تو اچانک ہی چلا جائے

پیوند کہاں تک لگیں اب خرقۂ غم کو
اس پوششِ رُسوائی کو تبدیل کیا جائے

اب بخیہ گروں میں یہی آئینِ رفو ہے
جو زخم سیا جائے اُدھورا ہی سیا جائے

اک چادرِ دلداری ہے اس طرح سے مجھ پر
تن ہے کہ اُلجھتا رہے، سر ہے کہ کھُلا جائے

سب کے لئے جاری ہے تو اے حسنِ جہانگیر
اس بارغریبوں سے بھی انصاف کیا جائے

ہیں سرخ قبا اتنے کہ مشکل میں صبا ہے
تزئینِ گلستاں کے لئے کس کو چنا جائے

سمجھوتہ ہے تو اشکِ ندامت سے رقم ہو
اعلانِ بغاوت ہے تو پھر خوں سے لکھا جائے

اے گردشِ دوراں ترے احسان بہت ہیں
کچھ دیر ترے ساتھ بھی اب رقص کیا جائے

دُنیا سے بے نیاز ہوں، اپنی ہوا میں ہوں
جب تک میں تیرے دل کی محبّت سرا میں ہوں

اک تخت اور میرے برابر وہ شاہ زاد
لگتا ہے آج رات میں شہرِ سبا میں ہوں

خوشبو کو رقص کرتے ہُوئے دیکھنے لگی
سحرِ بہار میں کہ طلسمِ صبا میں ہوں

ورنہ غبارِ ماہ بھی کب مجھ کو چھو سکا
آہستہ رو ہوئی ہوں کہ شہرِ نوا میں ہوں

جیسے کوئی عقب سے بلاتا ہے بار بار
بچپن سے اِک عجیب سرابِ صدا میں ہوں

اس دل کو جب سے غم کی ضمانت میں دے دیا
اُس وقت سے کسی کے حصارِ دُعا میں ہوں

تازہ محبتوں کا نشہ جسم و جاں میں ہے
پھر موسمِ بہار مرے گلستاں میں ہے

اِک خواب ہے کہ بارِ دگر دیکھتے ہیں ہم
اِک آشنا سی روشنی سارے مکاں میں ہے

تابش میں اپنی مہر و مہہ و نجم سے سوا
جگنو سی یہ زمیں جو کفِ آسماں میں ہے

اِک شاخِ یاسمین تھی کل تک خزاں اَثر
اور آج سارا باغ اُسی کی اماں میں ہے

خوشبو کو ترک کر کے نہ لائے چمن میں رنگ
اتنی تو سُوجھ بُوجھ مرے باغباں میں ہے

لشکر کی آنکھ مالِ غنیمت پہ ہے لگی
سالارِ فوج اور کسی امتحاں میں ہے

ہر جاں نثار یاد دہانی میں منہمک
نیکی کا ہر حساب دلِ دوستاں میں ہے

حیرت سے دیکھتا ہے سمندر مری طرف
کشتی میں کوئی بات ہے یا بادباں میں ہے

اُس کا بھی دھیان جشن کی شب اے سپاہِ دوست
باقی ابھی جو تیر عدو کی کماں میں ہے

بیٹھے رہیں گے شام تلک تیرے شیشہ گر
یہ جانتے ہوئے کہ خسارہ دکاں میں ہے

مسند کے اتنے پاس نہ جائیں کہ پھر کھلے
وہ بے تعلقی جو مزاجِ شہاں میں ہے

ورنہ یہ تیز دھوپ تو چبھتی ہمیں بھی ہے
ہم چپ کھڑے ہوئے ہیں کہ تو سائباں میں ہے

بہار اپنی بہار پر ہے

درخت اپنا لباس تبدیل کر رہے ہیں
کہیں کسی شاخِ سبز کی اوڑھنی پہ ہلکی سنہری سی گوٹ لگ رہی ہے
کہیں کسی زرد رنگ پتّی کا حاشیہ سرخ ہو رہا ہے
کہیں قبائے شجر گلابی سی ہو گئی ہے
کہیں ہرے پیڑ زرد، نارنج چادریں اوڑھنے لگے ہیں
کہیں فقط قرمزی سی اک روشنی درختوں پہ اپنا ہالہ کئے ہوئے ہے
کہیں پہ کنجِ چمن شہابی دِیوں کی لَو سے دمک اُٹھا ہے
کہیں پہ جیسے زمرّدیں شاخسار پر لعل کھل اُٹھے ہیں
فضا میں یاقوت بہہ رہا ہے
ہوا کے رخسار سرخ ہونے لگے ہیں
اِک خوشگوار ٹھنڈک نے شہر کو بازوؤں میں اپنے سمیٹ کر
خوش دِلی سے یوں پیار کر لیا ہے
کہ صبح گلنار ہو گئی ہے!

تمام پیڑوں کے ہاتھ سے پھول گر چکے ہیں
پر ایسا لگتا ہے

جیسے جنگل میں آ گیا رنگ ریز کوئی
بڑی مہارت سے
ایک اک پیڑ کی قبا رنگنے میں مصروف ہو گیا ہے
کہیں پہ شبنم کی آب ہے
اور کہیں پہ ابرق ہے دھوپ کی
جس کی روشنی میں
مرا چمن جھلملا رہا ہے
خزاں کا چہرہ نکھار پر ہے
اک اور منظر کے رنگ و بو کی
بہار اپنی بہار پر ہے!

شہزادی کا المیہ

محل کے نیچے
ہجومِ عشاق منتظر ہے
کہ خواب گہ کا حریری پردہ ذرا ہٹے تو
سب اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرائیں
اور یہ کہنے کا موقع پائیں
کہ عُلیا حضرت!
ہمیں بھی پہچانیے
کہ ہم نے
خزاں کی رُت میں
سیاہ اپریل کے اوائل میں
شامِ بے وارثی اترنے کی ساعتِ بے لحاظ میں
دودمانِ عالی جناب کو چادرِ عزا نذر کی تھی
جن کے کناروں پر تارِ خوں سے اب تک
ہمارے ناموں کے حرفِ اوّل کشیدہ ہوں گے
جو خامشی سے کھُلے سروں اور ننگے قدموں سے

پارۂ نان و جرعۂ آب لے کے
اُس شام سمتِ مقتل گئی تھیں
وہ عورتیں ہمارے نکاح میں تھیں
سوادِ شہرِ صبا میں
خوشبو کی واپسی کے لئے
وہ ہم تھے
جو مثلِ خاشاک دَربدر تھے
شمالی یورپ کے دُور افتادہ یخ کدے میں
تمام تر مرکزی نظام حرارت و نور و نغمگی میں
وہ ہم تھے جو
سخت اجنبیت کی برفباری میں جل رہے تھے
اور اپنے گھر بار، اپنی املاک، اپنے پیشوں سے دُور ہو کر
نئے وسیلوں سے رزق کی دوڑ میں تھے شامل
خمیری روٹی کی یاد میں
سینڈوچ پہ کرتے رہے گزارا
(یہ کارِ غالیچہ و جواہر تو صرف فرصت کا مشغلہ تھے)
جو لوگ گمنام و سادہ دل تھے
سرشتِ موسم نہیں سمجھتے تھے
اور پیچھے وطن میں رہ کر

ہمارے حصے کے دن
عقوبت کدوں میں تنہا گزارنے
اور ہمارے حصے کے کوڑے بھی
نوش جان کرنے میں منہمک تھے
(شراکت کا رہی تو کوئی اصول ٹھہرا)
مُباح ہو گا کہ ان کی قربانیوں کا بھی کچھ حساب ہو جائے
اور عطا ہو
انہیں بھی
دینارِ سرخ و رہوارِ مُشک رنگ و اراضیِ سبزہ آفریں و
کلاہِ زرتار و خلعتِ کارچوب و دوشالہ
شاہ طوسی!

جہاں پناہ !
یہ تو دیکھئے
آپ کے لئے
ترک ہم نے کیا کچھ کیا ہے اب تک
کہیں ترقی کا ایک زینہ
کہیں عنایاتِ خسروی کا کوئی وسیلہ
کہیں کوئی منفعت اثر رشتۂ سیاست
کہیں کوئی سیم رنگ شملہ

کہیں کوئی زر نگار طرّہ
اور ان سے بڑھ کر
وطن کی خوشبو، وطن کی گرمی !

ہمارے ایثار کے تناسب سے
اب صلے کی نوید پہنچے
کسی دیارِ غزال چشماں و گل عذاراں میں ہم کو تفویض ہو سفارت
مناصبِ مال و فضل و املاک کی وزارت
نہیں تو بابِ مشاورت ہی کھلے کسی پر
جو یہ نہیں تو
کسی علاقے کی صوبہ داری
کسی ریاست میں منصبِ چار دہ ہزاری
بکارِ خاص افسروں کی لمبی قطار ہی میں کوئی جگہ دیں
ہمیں صلہ دیں !

کسی طرح قربِ تاج و دربار کی فضیلت ہمیں عطا ہو
حضور کی بارگاہِ جود و سخا میں
حاضر جو ہونا چاہیں
تو کوئی درباں ہمیں نہ روکے
تو کوئی حاجب، مقرّبِ خاص تک نہ ٹوکے
غلام گردش میں مثلِ موجِ صبا گزرنے کی ہو اجازت !

یہ کیا کہ
تم سے بہت کہیں بعد آنے والے تو راج رتھ میں اڑے پھر رہے ہیں
اور ہم فقط گردِ راہ دیکھیں :
ہمیں صلہ دیں :

عرائضوں اور عرضیوں کے طوفانِ بے پناہ میں
گھری ہوئی ایک شاہزادی
کبھی کبھی سوچتی تو ہوگی
کہ اپنی چھوٹی سی سلطنت کو
جو پہلے ہی دشمنوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہی ہے
خود اپنی پیاری سپاہ سے کس طرح بچائے !

سیرِ دُنیا کرے دل، باغ کا در تو کھولے
یہ پرندہ کبھی پرواز کو پَر تو کھولے

مَیں تو تا عمر، ترے شہر میں رُکنا چاہوں
کوئی آکر مرا اسبابِ سفر تو کھولے

خود بھی جنگل کو بھی مجھے کاٹنا آجائے گا
پَر وہ شہزادہ مری نیند کا دَر تو کھولے

پھُول کچھ تیز مہک والے بھی اس بار کھلیں
آکے برسات مرا زخمِ جگر تو کھولے

کتنی آنکھیں ہیں جو بھُولی نہیں شب بیمائی
بانوئے شہر مگر لُطف کا دَر تو کھولے

انکار

شہر کے سارے معتبر آخر اُسی طرف ہوئے
جانبِ لشکرِ عدُو، دوست بھی صف بہ صف ہوئے

جاں سے گذر گئے مگر بھید نہیں کھُلا کہ ہم
کس کی شکار گاہ تھے کس کیلئے ہدف ہوئے

مشہدِ عشق کے قریب صبح کوئی نہیں ملا
وہ بھی کہ جن کے ضامنی اہلِ قمؑ و نجف ہوئے

اب تو فقط قیاس سے راہ نکالی جائے گی
جن میں تھیں کچھ بشارتیں خواب تو وہ تلف ہوئے

خانۂ بے چراغ بھی سب کی نظر میں آ گیا
تیرے قیام کے طفیل ہم بھی تو باشرف ہوئے

زندگی کی دُھوپ میں اِس سر پہ اِک چادر تو ہے
لاکھ دیواریں شکستہ ہوں پر اپنا گھر تو ہے

جو بھی آئے گا یہاں دستک تو دے کر آئے گا
اِک حدِ دیوار تو ہے اِک حصارِ در تو ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ اپنی جنگ میں تنہا نہیں
کارزارِ زندگی میں میرا اِک لشکر تو ہے

کون ہے اب تک عناصر کو بہم رکھے ہوئے
موسمِ بے چہرگی میں کوئی صورت گر تو ہے

گھر سے نکلی تو خبر بن جائے گی آپس کی بات
جو بھی قصّہ ہے ابھی تک صحن کے اندر تو ہے

اِک جھلک اُس کے ارادوں کی یہاں بھی دیکھ لی
فیصلے کے باب میں گو عرصۂ محشر تو ہے

سانحہ دو نیم ہونے کا پُرانا تو نہیں!
اور دلوں میں بھی ابھی تاریخ کا کچھ ڈر تو ہے

ڈھونڈلے گا پھر اُفق کھوئی ہوئی پرواز کا
دیکھنے میں آج یہ طائر شکستہ پر تو ہے

آسمانِ سبزگوں پر ایک تارہ ایک چاند
دسترس میں کچھ نہ ہو یہ خوشنما منظر تو ہے

ہوائے تازہ میں پھر جسم و جاں بسانے کا
دریچہ کھولیں کہ ہے وقت اُن کے آنے کا

اثر ہوا نہیں اُس پر ابھی زمانے کا
یہ خواب زاد ہے کردار کس فسانے کا

کبھی کبھی وہ ہمیں بے سبب بھی ملتا ہے
اثر ہُوا نہیں ہے اُس پر ابھی زمانے کا

ابھی میں ایک محاذِ دگر پہ اُلجھی ہوں
چُنا ہے وقت یہ کیا مجھ کو آزمانے کا

کچھ اس طرح کا پُر اسرار ہے ترا لہجہ
کہ جیسے راز کُشا ہو کسی خزانے کا

دُعا یہ کی ہی نہیں تُو مِرا مقدّر ہو
ہوا کی طرح مگر سانس بھر میسّر ہو

اسی طرح رہیں گردش میں میرے شام و سحر
تُو ہی مدام مری زندگی کا محور ہو

سپہرِ عمر میں جس وقت شام ہو جائے
کوئی چراغ جلانے کو گھر کے اندر ہو

کوئی بتائے کہ جشنِ بہار کیسے منائے
اِک ایسی بیل جو صحنِ چمن کے باہر ہو

کبھی کبھی تو دلِ مضطرب یہ چاہتا ہے
کہ چاند رات ہو اور سامنے سمندر ہو

یہ دل میسّر و موجود سے بہلتا نہیں
کوئی تو ہو جو مری دسترس سے باہر ہو

راہ دشوار کی جو دھول نہیں ہو سکتے
ان کے ہاتھوں میں کبھی پھول نہیں ہو سکتے

تیرے معیار پہ پورے نہ اترنے والے
منصبِ عشق سے معزول نہیں ہو سکتے

اتنا خوں ہے مرا گلشن میں کہ اب میرے خلاف
پیڑ ہو جائیں مگر پھول نہیں ہو سکتے

حاکمِ شہر کے اطراف وہ پہرہ ہے کہ اب
شہر کے دکھ اسے موصول نہیں ہو سکتے

فیصلے جن سے ہو وابستہ وطن کی قسمت
صرف اندازوں پہ محمول نہیں ہو سکتے

خون پینے کو یہاں کوئی بلا آتی ہے
قتل تو روز کا معمول نہیں ہو سکتے

جنبشِ ابروئے شاہاں نہ سمجھنے والے
کسی دربار میں مقبول نہیں ہو سکتے

زندگی بے سائباں، بے گھر کہیں ایسی نہ تھی
آسماں ایسا نہیں تھا اور زمیں ایسی نہ تھی

ہم بچھڑنے سے ہُوئے گمراہ ورنہ اس سے قبل
میرا دامن تر نہ تھا تیری جبیں ایسی نہ تھی

اب جو بدلا ہے تو اپنی رُوح تک حیران ہوں
تیری جانب سے میں شاید بے یقیں ایسی نہ تھی

بدگمانی جب نہ تھی، تُو بھی نہیں تھا معترض
میں بھی تیری شخصیت پر نکتہ چیں ایسی نہ تھی

کیا مرے دل اور کیا آنکھوں کا حصّہ ہے مگر
چادرِ شب اس سے پہلے شبنمیں ایسی نہ تھی

کیا ہوا آئی کہ اتنے پھُول دل میں کھِل گئے
پچھلے موسم میں یہ شاخِ یاسمیں ایسی نہ تھی

ہوا کے ہوتے ہوئے روشنی تو کر جائے
مری طرح سے کوئی زندگی تو کر جائے

تمام عمر تاسف میں ہی بسر ہو گی
تری طرف سے نظر بے رخی تو کر جائے

چراغ دل تہہِ محرابِ جاں نہ چھوڑے گی
ہوا کے ساتھ کوئی دشمنی تو کر جائے

پھر اس کے بعد جہاں میں کہیں پناہ نہیں
ترے حضور یہ جاں سرکشی تو کر جائے

وہ دشمنی کے بھی قابل نہ مجھ کو چھوڑے گا
اس آدمی سے یہ دل دوستی تو کر جائے

ہر ذرہ جیسے آئنہ بر دوش ہو گیا
یہ کون تھا جو خاک میں روپوش ہو گیا

اس کشمکش میں ہم نے ہی کھینچا وفا سے ہاتھ
بارِ جفا سے کوئی سبکدوش ہو گیا

اِک دل اور اُس پہ اتنا ہجومِ غم و الم
اچھا ہوا کہ زود فراموش ہو گیا

آوازِ احتجاج ہی مدھم تھی یا کہ پھر
وہ شور تھا کہ شہر گراں گوش ہو گیا

اک شخص کیا گیا کہ بھرا شہر دفعتاً
بے حوصلہ و بددل و کم کوش ہو گیا

تُو انتخابِ رنگ میں مصروف اور ادھر
کوئی ترے جنوں میں سیہ پوش ہو گیا

اِک شخص ٹوکتا تھا بہت اہلِ شہر کو
مژدہ کہ آج رات وہ خاموش ہو گیا

حلقہ در حلقہ برائے پند و وعظ آنے لگے
تیرے کوچے میں گئے اور لوگ سمجھانے لگے

عکسِ بے منظر سے دل تسکین سی پانے لگے
دھوپ میں جیسے کوئی آئینہ چمکانے لگے

باغ اور ابر بہار اور رات اور خوشبوئے دوست
ایک خواہش سو طرح کے رنگ دکھلانے لگے

اتنی خاموشی بھی گرد و پیش میں طاری نہ ہو
دل دھڑکنے کی صدا کانوں میں صاف آنے لگے

زرد ہوتا جا رہا ہے صحنِ دل کا ہر شجر
جس طرح اندر ہی اندر دکھ کوئی کھانے لگے

تیری دنیا سے نکل جاؤں میں خاموشی کے ساتھ
قبل اس کے تو مرے سائے سے کترانے لگے

پیشِ آثارِ قدیمہ رک گئے میرے قدم
شہر کے دیوار و در کچھ جانے پہچانے لگے

دِل کی بربادی کا کوئی سلسلہ پہلے سے تھا
اِس چراغِ شب پہ الطافِ ہوا پہلے سے تھا

اُس کے یوں ترکِ محبت کا سبب ہوگا کوئی
جی نہیں یہ مانتا وہ بے وفا پہلے سے تھا

دونوں اپنی زندگی کے جھٹپٹے میں ہیں مگر
اِس طرح مِلنا مقدّر میں لکھا پہلے سے تھا

اَب تو زخمِ دل نمک خوارِ توجہ ہے تِرا
نام پر جاری تِرے حرفِ دُعا پہلے سے تھا

راستہ بھولا نہیں اَب کے پرندِ خوش خبر
اَور کچھ اُجڑا ہُوا شہرِ سبا پہلے سے تھا

تیرے آنے سے تو بس زنجیر ہی بدلی گئی
ہم اسیروں پر جفا کا باب وا پہلے سے تھا

اسی دن گھر نہیں آتا کہ جب آنے کو کہتا ہے
مگر کیا رُوٹھنا اُس سے وہ اپنی دُھن میں رہتا ہے

مدارات الم میں وہ نہیں شرکت کا کچھ قائل
نہ اپنے دُکھ بتاتا ہے نہ میرے رنج سہتا ہے

لبِ خاموش، چشمِ خشک کیا سمجھائیں گے تجھکو
جو بارش دل میں ہوتی ہے جو دریا دل میں بہتا ہے

مجھے تجھ سے جُدا رکھتا ہے اور دُکھ تک نہیں ہوتا
مرے اندر ترے جیسا یہ آخر کون رہتا ہے

خیالِ یار ابھی روشن، ابھی نظروں سے اوجھل ہے
ابھی یہ ریشمیں دریا پہاڑوں میں ہی بہتا ہے

چارہ سازوں کی اذیّت نہیں دیکھی جاتی
تیرے بیمار کی حالت نہیں دیکھی جاتی

دینے والے کی مشیّت پہ ہے سب کچھ موقوف
مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی

دن بہل جاتا ہے لیکن ترے دیوانوں کی
شام ہوتی ہے تو وحشت نہیں دیکھی جاتی

تمکنت سے تجھے رخصت تو کیا ہے لیکن
ہم سے اِن آنکھوں کی حسرت نہیں دیکھی جاتی

کون اُترا ہے یہ آفاق کی پہنائی میں
آئینہ خانے کی حیرت نہیں دیکھی جاتی

جُز غبارِ راہ کچھ پیشِ نظر رکھا نہیں
ہم نے اپنے ساتھ اسبابِ سفر رکھا نہیں

ایک کُوزہ، اِک عصا، اِک خرقۂ گِل کے سوا
ہم فقیروں نے کسی نعمت کو گھر رکھا نہیں

ایک بار اُس نے مرے عیبوں پہ پردہ رکھ لیا
اس رعایت کو مگر بارِ دگر رکھا نہیں

رات تھے گھر پر چراغ اور عطر اُس کے منتظر
پاؤں تک لیکن ہوا نے بام پر رکھا نہیں

جنگلوں میں شام اُتری، خون میں ذاتِ قدیم
دل نے اُس کے بعد انہونی کا ڈر رکھا نہیں

پہنچے جو سرِ عرش تو نادار بہت تھے
دُنیا کی محبّت میں گرفتار بہت تھے

گھر ڈوب گیا اور اُنہیں آواز نہیں دی
حالانکہ مرے سلسلے اُس پار بہت تھے

چھت پڑنے کا وقت آیا تو کوئی نہیں آیا
دیوار گرانے کو رضا کار بہت تھے

گھر تیرا دکھائی تو دیا دُور سے لیکن
رستے تری بستی کے پُراسرار بہت تھے

ہنستی ہوئی آنکھوں کا طنز سہتے رہے ہم
جس شہر میں نوحے پسِ دیوار بہت تھے

یہ بے رُخی اک روز تو مقسوم تھی اپنی
ہم تیری توجّہ کے طلبگار بہت تھے

آسائشِ دُنیا کا فسوں اپنی جگہ ہے
اس سُکھ میں مگر روح کے آزار بہت تھے

وقت ہوتا کہ مرا بخت عناں گیر سو ہے
تجھ سے ملنے میں یونہی ہوئی تھی تاخیر سو ہے

ہم ہی اس بار تپِ غم سے نہ بچنے پائے
وہ جو ہوتی تھی ترے ہاتھ میں تاثیر سو ہے

اتنی دشوار نہیں تھی گرہِ غم کی کشود
بے ہنر ہی تھا مرا ناخنِ تدبیر سو ہے

رم بہت تجھ میں ہے لیکن مرے خوابوں کے غزال
دل کو ہونا تھا ترے پاؤں کی زنجیر سو ہے

میں ستاروں کی سفارش بھی اگر لے آتی
یہی نکلی تھی مرے خوابوں کی تعبیر سو ہے

موجۂ گل کو ہم آواز نہیں کر سکتے
دن ترے نام سے آغاز نہیں کر سکتے

اس چمن زار میں ہم سبزۂ بیگانہ سبھی
آپ ہم کو نظر انداز نہیں کر سکتے

عشق کرنا ہے تو پھر سارا اثاثہ لائیں
اس میں تو کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

دکھ پہنچتا ہے بہت دل کو رویے سے ترے
اور مداوا ترے الفاظ نہیں کر سکتے

عشق میں یہ بھی کھلا ہے کہ اٹھانا غم کا
کار دشوار ہے اور بعض نہیں کر سکتے

....لیکن بڑی دیر ہو چکی تھی

اِک عُمر کے بعد اس کو دیکھا !

آنکھوں میں سوال تھے ہزاروں
ہونٹوں پہ مگر وہی تبسّم !
چہرے پہ لکھی ہوئی اُداسی
لہجے میں مگر بلا کا ٹھہراؤ
آواز میں گونجتی جُدائی
بانہیں تھیں مگر وصال ساماں

سمٹی ہوئی اس کے بازوؤں میں
تا دیر میں سوچتی رہی تھی
کس ابرِ گریز پا کی خاطر
میں کیسے شجر سے کٹ گئی تھی
کس چھاؤں کو ترک کر دیا تھا

میں اُس کے گلے لگی ہوئی تھی
وہ پُونچھ رہا تھا مرے آنسو
لیکن بڑی دیر ہو چکی تھی !

GOOD TO SEE YOU

بہت دنوں کے بعد اُسے
اک محفل میں دیکھا تھا
اک لمحے کو ہجر و وصال کے سارے موسم
آنکھوں میں لہرا سے گئے
دل میں چراغ سے جل اُٹھے
اس سے گلے ملنے کے تصور سے ہی
جیسے سارا وجود
پھولوں کی صورت کھل اُٹھا
اُن ہاتھوں کے لمس کو سوچ کے
سارا جسم سلگ اُٹھا
اُن ہونٹوں کی گرم گلابی نرمی کا خوش رنگ خیال
ہونٹوں پہ مسکا اُٹھا !

حلقۂ یاراں سے آخر
پل بھر کو فرصت پا کر

میری طرف وہ آیا بھی
میری جانب دیکھا بھی
پر جو کہا تو اتنا کہا
آپ سے مل کر خوشی ہوئی
میرے صحنِ دل میں اچانک ٹوٹنے والی
پت جھڑ سے یکسر لاعلم !

ایک منظر

کچا سا اک مکاں کہیں آبادیوں سے دور
چھوٹا سا ایک حجرہ فرازِ مکان پر
سبزے سے جھانکتی ہوئی کھپریل والی چھت
دیوارِ چوب پر کوئی موسم کی سبز بیل
اتری ہوئی پہاڑ پہ برسات کی وہ رات
کمرے میں لالٹین کی ہلکی سی روشنی
وادی میں گھومتا ہوا اک چشمۂ شریر
کھڑکی کو چومتا ہوا بارش کا جلترنگ
سانسوں میں گونجتا ہوا اک ان کہی کا بھید :

اُس نے پھول بھیجے ہیں

اُس نے پھول بھیجے ہیں
پھر مری عیادت کو
ایک ایک پتّی میں
اُن لبوں کی نرمی ہے
اُن جمیل ہاتھوں کی
خوشگوار حدّت ہے
اُن لطیف سانسوں کی
دلنواز خوشبو ہے

دل میں پھول کھلتے ہیں
رُوح میں چراغاں ہے
زندگی معطّر ہے

پھر بھی دل یہ کہتا ہے
بات کچھ بنا لیتا
وقت کے خزانے سے
ایک پل چرا لیتا
کاش وہ خود آ جاتا

HOT LINE

اُس کو مجھ سے کتنا گلہ تھا
"میرے اور تمہارے بیچ
اتنے لوگ آجاتے ہیں
بات نہیں ہو سکتی ہے

موسم کی پہلی بارش میں
رُت کی پہلی برفوں میں
پُورے چاند کی راتوں میں
شام کی مدھم خوشبو میں
صبح کی نیلی ٹھنڈک میں
کتنا بے بس ہوتا ہوں
دِل کتنا دُکھ جاتا ہے!"

آج مرے اور اس کے بیچ
کوئی تیسرا فرد نہیں ہے
ہاتھ کی اک ہلکی جُنبش سے

مجھ سے رابطہ ہو سکتا ہے
لیکن وہ آواز سُنے
کتنے موسم بیت گئے
میرے لئے بھی اُس کو بلانا
اتنا مشکل نہیں رہا
لیکن سچی بات یہ ہے
لہجوں اور آوازوں کے
ویسے رنگ نہیں ہیں اب
ذہن تو وہی ہے لیکن دل
ہم آہنگ نہیں ہیں اب!

VANITY THY NAME IS ....

بہت سادہ ہے وہ
اور اُس کی دُنیا، میری دُنیا سے سراسر مختلف ہے
الگ ہیں خواب اُس کے
زندگی میں اُس کی ترجیحات ہی کچھ اور لگتی ہیں
بہت کم بولتا ہے وہ
مجھے اُس نے لکھا ہے
صبح
میں نے لان میں کچھ خوبصورت پھول دیکھے
مجھے بے ساختہ یاد آ گئیں تم !

مجھے معلوم ہے
میں عمر کے اُس ملگجے حصے میں ہوں
جب میرا چہرہ
کسی بھی پھول سے قربت نہیں رکھتا
مگر جی چاہتا ہے
اس کی باتوں پر
ذرا سی دیر کو ایمان لے آؤں !

دِل کو مہر و مہ و انجم کے قریں رکھنا ہے
اِس مسافر کو مگر خاک نشیں رکھنا ہے

سہہ لیا بوجھ بہت کوزہ و چوب و گِل کا
اب یہ اسباب سفر ہم کو کہیں رکھنا ہے

ایک سیلاب سے ٹوٹا ہے ابھی ظلم کا بند
ایک طوفاں کو ابھی زیرِ زمیں رکھنا ہے

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری
صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھنا ہے

درد نے پوری طرح کی نہیں تہذیب اِس کی
ابھی اِس دل کو ترا حلقہ نشیں رکھنا ہے

جب کبھی خوبیٔ قسمت سے تجھے دیکھتے ہیں
آئینہ خانے کی حیرت سے تجھے دیکھتے ہیں

وہ جو پامالِ زمانہ ہیں مرے تخت نشیں
دیکھ تو کیسی محبّت سے تجھے دیکھتے ہیں

کاسۂ دید میں بس ایک جھلک کا سکّہ
ہم فقیروں کی قناعت سے تجھے دیکھتے ہیں

تیرے کوچے میں چلے جاتے ہیں قاصد بن کر
اور اکثر اسی صورت سے تجھے دیکھتے ہیں

تیرے جانے کا خیال آتا ہے گھر سے جس دم
در و دیوار کی حسرت سے تجھے دیکھتے ہیں

کہہ گئی بادِ صبا آج ترے کان میں کیا
پھول کس درجہ شرارت سے تجھے دیکھتے ہیں

تجھ کو کیا علم تجھے ہارنے والے کچھ لوگ
کس قدر سخت ندامت سے تجھے دیکھتے ہیں

امیدِ معجزۂ یک نظر پہ زندہ ہیں
طبیبِ شہر دُعا کے اثر پہ زندہ ہیں

ہم اہلِ حاجت و اربابِ احتیاج تو کیا
فقیہہِ شہر بھی اب حُبِّ زر پہ زندہ ہیں

یہ اور بات کہ حاکم تھے بیشتر نااہل
ہم ایسے لوگ تو صرف نظر پہ زندہ ہیں

خُدا کرے کہ ہوا کو ابھی پتہ نہ چلے
کہ کچھ چراغ مرے بام و دَر پہ زندہ ہیں

رہِ وفا میں ابھی ہیں کچھ ایسے لوگ کہ جو
سفر سے بڑھ کے خیالِ سفر پہ زندہ ہیں

عطا ہوئی جنہیں دربار سے کبھی خلعت
خیالِ بخششِ بارِ دگر پہ زندہ ہیں

گلابی پھول دِل میں کھل چکے تھے
ہم اِس موسم میں تجھ سے مِل چکے تھے

توجّہ سے تری پھر کھل رہے ہیں
وگرنہ زخم تو یہ سِل چکے تھے

ستوں کتنا سہارا ان کو دیتے
جو گھر بنیاد سے ہی ہل چکے تھے

پرُانی اجنبیّت لوٹ آئی
ہم اُن سے اور وہ ہم سے مل چکے تھے

تر و تازہ تھی جاں راہِ جنوں میں
اگرچہ پاؤں اپنے چھل چکے تھے

تمھاری زندگی میں

تمہاری زندگی میں
میں کہاں پر ہوں ؟

ہوائے صبح میں
یا شام کے پہلے ستارے میں
جھجکتی بوندا باندی میں
کہ بے حد تیز بارش میں
رو پہلی چاندنی میں
یا کہ پھر تپتی دوپہروں میں
بہت گہرے خیالوں میں
کہ بے حد سرسری دُھن میں
تمہاری زندگی میں
میں کہاں پر ہوں ؟

ہجومِ کار سے گھبرا کے
ساحل کے کنارے پر

کسی ویک اینڈ کا وقفہ
کہ سگرٹ کے تسلسل میں
تمہاری انگلیوں کے بیچ
کوئی بے ارادہ ریشمیں فرصت ؟
کہ جامِ سُرخ سے
یکسر تہی
اور پھر سے
بھر جانے کا خوش آداب لمحہ
کہ اِک خوابِ محبت ٹوٹنے
اور دُوسرا آغاز ہونے کے
کہیں مابین اک بے نام لمحے کی فراغت ؟

تمہاری زندگی میں
میں کہاں پر ہوں ؟

ہمارے درمیاں ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا .....

ہمارے درمیاں ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا
ترے شانوں پہ کوئی چھت نہیں تھی
مرے ذمّے کوئی آنگن نہیں تھا
کوئی وعدہ تری زنجیرِ پا بننے نہیں پایا
کسی اقرار نے میری کلائی کو نہیں تھاما
ہوائے دشت کی مانند
تُو آزاد تھا
رستے تری مرضی کے تابع تھے
مجھے بھی اپنی تنہائی پہ
دیکھا جائے تو
پورا تصرّف تھا !

مگر جب آج تُو نے
راستہ بدلا
تو کچھ ایسا لگا مجھ کو
کہ جیسے تُو نے مجھ سے بے وفائی کی !

نیاگرہ فالز

فرازِ کوہ سے گرتی ہوئی سیّال چاندی
نگارِ زندگی کا خوابِ سیمیں
طلسمِ آب میں عکسِ سپہرِ لاجوردی دم بخود ہے
فسونِ رنگ میں ڈوبی زمینِ آبنوسی ہفت پیکر ہو گئی ہے
خمِ محرابِ کوہِ ارغوانی پر
روپہلی مسکراہٹ ہے
نگاہیں حسن کی دہشت میں گم ہیں
شکوہِ آب نے جیسے کہ نظریں باندھ دی ہیں
روپہلی روشنی کرتی ابابیلیں
ستارہ وار جیسے
قوسِ آبِ نیلمیں کے گرد چکر کاٹتی ہیں
عجب آواز ہے یہ
اور عجب ہیں رنگ اس کے
عجب قوت ہے یہ اپنی طرف مجھ کو بلاتے ہیں
لہو میں رقص کرتی جا رہی ہے وحشتِ پیہم
دریں وحشت بطرزِ آہوئے دیوانہ می رقصم
کہ آب آتش شُد و من صورتِ پروانہ می رقصم

ویسٹ منسٹر ایبے

قدم نہیں اُٹھتے ہیں
جانے کس کے سر پہ
کس کے دل پر
پاؤں پڑ جائے
یہاں اِس ٹھنڈے فرش کے نیچے
گرمیٔ خواب سے جلنے والی
کتنی آنکھیں خوابیدہ ہیں
کتنے کشیدہ سر، اب کیسے خمیدہ ہیں
وہ جو دنیاوی فرہنگ میں
خوش طالع کہلاتے تھے
جن کے بخت کا تارہ
وقت کے ماتھے پر کچھ ایسے چمکا
جیسے کبھی غروب نہ ہو گا
جن کی فکر نے
ایک ہجوم کا دھارا موڑا تھا

کوئی وقت، کوئی حرکت اور کوئی مقام سے آگے تھا
دو تثلیثوں کا ٹکراؤ!
عزتِ نفس کا پرچم آکر کیسی ہوا میں لہرایا تھا
خاموشی کی اک اپنی آواز ہے لیکن
حد سے بڑھے تو
سناٹا بھی بول اٹھتا ہے!
گرجا کے اس سحر زدہ سے نیم دھندلکے میں
دیواروں پر بنی ہوئی تصویریں زندہ لگتی ہیں
خندۂ استہزا سے مجھ کو دیکھتی ہیں
لڑکی! تو کس زعم میں ہے
شعر تو ہم بھی لکھتے تھے
ہم بھی آگ سے خاک ہوئے
کل تو بھی مٹی میں مٹی ہو جائے گی
لیکن ہم میں اور تجھ میں اک فرق رہے گا
تیرے نام کا تارہ بھی
تیری طرح بجھ جائے گا!

جانے کب تک رہے یہی ترتیب
دو ستارے کھلے قریب قریب

چاند کی روشنی سے اس نے لکھی
میرے ماتھے پہ ایک بات عجیب

نا نوشتہ اس کے سامنے تھی
اس نے دیکھا نہیں تو میرا نصیب

بدن تک جس کی آنچ آتی ہے
اب یہ شعلہ رو ہے دل کے قریب

چاند کے پاس یہ کھلا تارہ
بن گیا سارا آسمان رقیب

شجرۂ اہل درد کس سے ملے
شہر میں [illegible] ہے عجیب

آنکھوں کے لیے جشن کا پیغام تو آیا
تاخیر سے ہی چاند لبِ بام تو آیا

اُس باغ میں اک پھول کھلا میرے لیے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا

پت جھڑ کا زمانہ تھا تو یہ بخت ہمارا
سیرِ چمنِ دل کو وہ گلفام تو آیا

اُڑ جائے گا پھر اپنی ہواؤں میں تو کیا غم
وہ طائرِ خوش رنگ تہِ دام تو آیا

ہر چند کہ کم عرصۂ زیبائی ہی ٹھہرا
ہر چہرۂ گُل باغ کے کچھ کام تو آیا

جب وہ تھے ہم نظمِ گلستاں سے تو خوش تھے
تحسین بھی جاتی رہی انعام تو آیا

واضح تو ہوا ترکِ محبت کا ارادہ
بارے دلِ آشفتہ کو آرام تو آیا

شب سے بھی گزر جائیں گے گر تیری رضا ہو
دورانِ سفر مرحلۂ شام تو آیا

جو صبح خواب ہوا، شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اُس سے مرا دل اُداس کتنا تھا

وہ اور شے تھی قبا جس سے ہو گئی رنگیں
اُسے پتہ ہے کوئی خوش لباس کتنا تھا

خبر نہیں کہ تجھے دیکھنے میں آنکھوں کا
یقین کتنا رہا اور التباس کتنا تھا

بغیر دیکھے ہی لوٹا دیے جو پھول آئے
کسی کے حق میں یہ دل ناسپاس کتنا تھا

وہ جس کو بزم میں مہمانِ عام بھی نہ کہا
کسے بتائیں کہ خلوت میں روشناس کتنا تھا

دِل کی حالت ہے اِضطرابی پھر
کوئی لائے گا یہ خرابی پھر

ایک مدّت کے بعد خوابوں کا
پیرہن ہو گیا گلابی پھر

لے رہی ہے طویل رات کے بعد
زندگی غسلِ آفتابی پھر

دھیان کی رحل پہ بصد مفہوم
ایک چہرہ کھُلا کتابی پھر

کٹ ہی جائے گی شب کہ آنکھوں میں
ایک صورت ہے ماہتابی پھر

چھُو رہی ہے ہوا زمستانی
شجرِ جاں ہوا شہابی پھر

گر رہے ہیں ترے خیال کے پھُول
خوبصورت ہے فرشِ خوابی پھر

شرحِ آسودگی میں حائل ہے
معنیٔ غم کی دیریابی پھر

سفرِ خواب

بہت ہی خوبصورت خواب تھا
جو کچی عمروں میں
میں اکثر دیکھتی تھی
یہ — کہ
پورے چاند کی شب ہے
زمیں سے آسماں تک
روشنی کی ایک سیڑھی بن گئی ہے
مرے تن پر ستاروں سے بنا ملبوس ہے
اک ہاتھ میں تازہ گلاب
اور دوسرے میں تیرا بازو ہے
میں تیرا ہاتھ تھامے
زینہ در زینہ قدم رکھتی ہوں
نامعلوم دنیا کے سفر پر ہوں
تری سانسوں کی خوشبو
رات کی رانی کا جادو

چاندنی کا لمس
آپس میں گھلتے جاتے ہیں
میری رُوح میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں !

یہ سپنا جل چکا تھا
بس اس کی راکھ میری رُوح میں اکثر اڑا کرتی
مگر کل شب
شبِ مہتاب تھی
اور آسماں تک نُور کی سیڑھی بنی تھی
ستاروں سے بھرا آنچل تھا میرا
مرے اک ہاتھ میں ہلکے گلابی پھول تھے
اور دُوسرا اک اجنبی کے ہاتھ میں تھا
جس کا ہر انداز تجھ سے مختلف تھا
مگر اُس آنکھ میں جو جگمگاہٹ تھی
مری دیکھی ہوئی تھی
اور اُس لب پر جو دلکش مسکراہٹ تھی
مری چُومی ہوئی تھی !

ایک نثریہ نظم

جشنِ بہار تھا
بارش فرشِ گل پہ مسلسل ناچ رہی تھی
ہوا کی لَے تھی بے حد شوخ
پیڑ خوشی سے جھوم رہے تھے
ساری فضا پتوں کی ہنسی سے گونج رہی تھی !
صحنِ چمن کے گوشے میں
میں بھی کھڑی تھی تیرے ساتھ
رُوح کا دامن کھینچ رہی تھی
تیرے پیراہن کی آنچ
میرے اور بارش کے لبوں پر
کھیل رہی تھی
ایک ہی بات
تیرے ہونٹ، تری پیشانی، ترے ہات !

وہ باغ میں میرا منتظر تھا

وہ باغ میں میرا منتظر تھا
اور چاند طلوع ہو رہا تھا
زلفِ شبِ وصل کُھل رہی تھی
خوشبو سانسوں میں گُھل رہی تھی
آئی تھی میں اپنے پی سے ملنے
جیسے کوئی گُل ہوا سے کھلنے
اِک عُمر کے بعد میں ہنسی تھی
خود پر کتنی توجہ دی تھی!

پہنا گہرا بسنتی جوڑا
اور عطرِ سہاگ میں بسایا
آئینے میں خود کو پھر کئی بار
اُس کی نظروں سے میں نے دیکھا
صندل سے چمک رہا تھا ماتھا
چندن سے بدن دمک رہا تھا
ہونٹوں پہ بہت شریر لالی
گالوں پہ گُلال کھیلتا تھا

بالوں میں پڑے اتنے موتی
تاروں کا گمان ہو رہا تھا
افشاں کی لکیر مانگ میں تھی
کاجل آنکھوں میں ہنس رہا تھا
کانوں میں مچل رہی تھی بالی
بانہوں سے لپٹ رہا تھا گجرا
اور سارے بدن سے پھوٹتا تھا
اس کے لئے گیت جو لکھا تھا!

ہاتھوں میں لئے دیے کی تھالی
اُس کے قدموں میں جاکے بیٹھی
آئی تھی کہ آرتی اتاروں
سارے جیون کو دان کردوں!

دیکھا مرے دیوتا نے مجھ کو
بعد اس کے ذرا سا مسکرایا!
پھر میرے سنہرے تھال پر ہاتھ
رکھا بھی تو اِک دِیا اُٹھایا
اور میری تمام زندگی سے
مانگی بھی، تو ایک شام مانگی

شجر کے ہاتھ میں اک زرد پھول باقی ہے
ابھی لباسِ مسافر پہ دھول باقی ہے

مرے قبیلے میں نکلے سبھی فروختنی
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی اصول باقی ہے

درونِ شہر گلابوں کی باڑ ختم ہوئی
کنارِ شہر پرانی ببول باقی ہے

ہوائے شہرِ ستم کو ابھی پتہ نہ چلے
مرے دوپٹے میں اک سُرخ پھول باقی ہے

قسمت سے بھی کچھ سِوا دیا ہے
بارش نے ہمیں مِلا دیا ہے

دیکھی ہے مری اُداسی اُس نے
اور دیکھ کے مُسکرا دیا ہے

اَب تو مجھے صبر آ گیا تھا
یہ کِس نے مجھے رُلا دیا ہے

وُہ چاہے تو راستہ بدل لے
میں نے تو دِیا جلا دیا ہے

اُس رونقِ بزم نے تو میری
تنہائی کو بھی سجا دِیا ہے

وہ پل کہ سلگ اٹھا ہے ملبوس
اور اس نے دِیا بجھا دیا ہے

رُکنے کا سمے گزر گیا ہے
جانا ترا اَب ٹھہر گیا ہے

رخصت کی گھڑی کھڑی ہے سر پر
دل کوئی دو نیم کر گیا ہے

ماتم کی فضا ہے شہرِ دل میں
مجھ میں کوئی شخص مر گیا ہے

بجھنے کو ہے پھر سے چشمِ نرگس
پھر خوابِ صبا بکھر گیا ہے

بس ایک نگاہ کی تھی اس نے
سارا چہرہ نکھر گیا ہے

بارِ احساں اٹھائے جس تس کا
دل اسیرِ طلب ہوا کس کا

ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا

یہ دعائے شفا ہے یا کچھ اور
اُس نے بھیجا ہے پھول نرگس کا

ضبط اِتنا نہیں ہے اشکوں پر
کچھ خیال آ گیا تھا مجلس کا

پھر سے خیمے جلے ہیں اور سرِ شام
بین ہے اپنے اپنے وارث کا

لوٹنا ہے مجھے گھر جائیگا آخر وہ بھی
میں بھی غربت میں ہوں، مانندِ مسافر وہ بھی

میں نے بھی پیاس کے صحرا میں بڑے دن کاٹے
جرعۂ آب کو ترسا ہوا طائر وہ بھی

میرا دُکھ بھی مرے چہرے سے نہیں کھُلتا ہے
اور سرِ بزم ہے فرخندہ بظاہر وہ بھی

اس کی حرمت کا مرے دل کو بھی ہے پاس بہت
چُپ رہے گا مری ناموس کی خاطر وہ بھی

کیا عجب ہے کہ یہ دل ہوش سے بیگانہ ہوا
شب کا افسوں بھی جنوں خیز تھا ساحر وہ بھی

کیا بات ہے جس کا غم بہت ہے
کچھ دن سے یہ آنکھ نم بہت ہے

مل لیتا ہے گفتگو کی حد تک
اتنا ہی ترا کرم بہت ہے

گھر آپ ہی جگمگا اُٹھے گا
دہلیز پہ اِک قدم بہت ہے

مل جائے اگر تری رفاقت
مجھ کو تو یہی جنم بہت ہے

کیا شب سے ہمیں سوال کرنا
ہونا ترا صبح دم بہت ہے

کیوں بجھنے لگے چراغ میرے
اب کے تو ہوا بھی کم بہت ہے

چپ کیوں تجھے لگ گئی ہے پروینؔ
سنتے تھے کہ تجھ میں رَم بہت ہے

عجب اِک ساعتِ گلفام آئی
صبا لے کر کسی کا نام آئی

کسی دل میں جزیرے کی نہ تھی چاہ
سمندر پہ اک ایسی شام آئی

اداسی مسکراتی ہے کہ اب کے
توجہ سے تری خوش کام آئی

دُعا اب چاہے بامِ عرش چھو لے
ترے دَر سے تو یہ ناکام آئی

تُو سوداگر ہے ایسا ہاتھ جس کے
کِسی کی زندگی بے دام آئی

یہ ساری زندگی کی بے نیازی
بالآخر حسن کے کیا کام آئی

رستہ ہی نیا ہے، نہ میں انجان بہت ہوں
پھر کوئے ملامت میں ہوں، نادان بہت ہوں

اک عمر جسے خواب کی مانند ہی دیکھا
چھونے کو ملا ہے تو پریشان بہت ہوں

مجھ میں کبھی آہٹ کی طرح سے کوئی آئے
اک بند گلی کی طرح سنسان بہت ہوں

دیکھا ہے گریز اُس نگہِ سرد کا اتنا
مائل بہ توجہ ہے تو حیران بہت ہوں

اُلجھیں گے کئی بار ابھی لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

فیض صاحب کے لئے ایک اور نظم

عجیب گھڑی ہے
ابھی تجھے سبز خانۂ خاک میں رکھے
اک پہر ہوا ہے
ابھی قبائے سخن سے
تیرے بدن کی گرمی گئی نہیں ہے
فرودگاہِ حیات میں رخصتِ سفر کی
تمام تر گرد دم بخود ہے
نشست کی جا نہیں ملی ہے
تری لحد کے گلاب ویسے ہی تازہ رو ہیں
صبا ابھی تیری مسکراہٹ سے مشکبو ہے !

ابھی تو رسمِ وداع پوری نہیں ہوئی تھی
کہ جانشینی کا مسئلہ چھڑ گیا ہے ہم میں
کسی کا کہنا کہ خرقۂ فن
اُسے ترے ہاتھ سے مِلا ہے
کوئی بزعمِ خود آن کر

مسندِ خلافت پہ رونق افروز ہو گیا ہے
مجاورینِ ادب، ترے مقبرے پہ
لوبان و عود و عنبر جلائے بیٹھے
سخن کا نذرانہ مانگتے ہیں
اک اک غزل کہنے والے نوخیز و سبزرُو کو دکانِ شہرِ سخن کو
آکر، بصد عنایت
بقا کی تعویذ بانٹتے ہیں
کہیں ترا نام بک رہا ہے
کہیں پہ آواز کا ہے سودا
سخن کی آڑھت عروج پر ہے!

نمائش

شہر کے بیچوں بیچ نمائش لگی ہوئی ہے
طرح طرح کے زخموں کے اسٹال لگے ہیں
کہیں بڑی محنت سے سُرخ رنگائے ہوئے دلکش ملبوس
سینت سینت کے رکھے ہُوئے تارِ داماں
پھٹے ہوئے آنچل
اور مسکی اوڑھنیاں

نم آلود، شکن بستہ، میلی چادر
لوحِ پشت پہ نیلم کی نقاشی والے جسم
حبسِ بے جا میں رکھے جانے والے کچھ خواب
گِروی رہنے والی آنکھیں
عمر قید پانے والی آشائیں
جلا وطن امُیدیں!

اس انبوہِ رنگ میں
کچھ ایسے بھی لوگ کھڑے ہیں
جن کے دل اور لان کے پھُول

کبھی نہیں مرجھائے
جن کی نرمیٔ پیراہن کو
بادِ صبا تک چھونے سے گھبراتی ہے
جن کے بدن پر اک ہلکا سا زخم لگے تو
لالہ رُخانِ شہر کی پلکیں
بہرِ رفو آجاتی ہیں
جن کی خواب گھوں کا ریشم
سپنے بُنتا رہتا ہے
نیلم اور یاقوت یہاں پر، اپنی جگہ پر ہوتے ہیں
خواب انہیں خود دیکھتے ہیں
عمر قید،
حبسِ بے جا
اور کالا پانی
جیسے لفظ
ان کے لئے نامحرم ہیں !
جن کے گھروں میں
فصل کے میوے
رُت کے پھُول
اور تہوار کی شیرینی
حاکمِ وقت کے توشۂ خاص سے بھجوائے جاتے ہیں
مخبرِ خاص کی خلعت پا کر
معتبرینِ شاہ میں شامل ہو کر

جو ہر صبح نکلتے تھے
زیرِ فلک نافرمانی کی سُن گُن لینے
زیرِ زمیں سچائی کی سرکوبی کرنے
اور ہر شام کو کافی ہاؤس میں
حاکمِ ناجائز کے خلاف
نیا تبرا لکھنے اور مکرر کہنے والے سادہ دلوں کے گھر کا پتہ
کارکنانِ سادہ قبا تک پہنچانے

چیزوں کی ترتیب اچانک بدل گئی ہے
سرچشمہ دُکھ ہے یا گلیسرین
آنسو یکساں چمک رہے ہیں !

ساری آنکھیں صف بستہ ہیں
دروازے پر لگی ہوئی ہیں
بانوئے شہر قدم رنجہ ہوں
فیتہ کاٹیں !

سندھ کی ایک بیٹی کا اپنے رسولؐ سے ایک سوال

اے دین کے آخری پیمبر
تھا لطف خدا کا خاص تجھ پر
بھیجا تھا تجھے بنا کے رحمت
ساری دنیا کے بے کسوں پر
ہوتی رہی تجھ پہ سنگ باری
ہونٹوں سے رہیں دعائیں جاری
ہر سود کو کر دیا تھا باطل
ہر خون معاف کر دیا تھا
تلواریں نیام میں رکھا دیں
چادر میں اٹھا کے سنگِ اسود
خود دار مسافرت کی تفسیر
عقبہ کی وہ باوقار بیعت
گھر چھوڑا کچھ اس طرح سے تو نے
ہجرت کو مثال کر دیا تھا

انصار و مہاجرین کیا تھے
ایثار و وفا کی اِنتہا تھے
وسعت سے دِلوں کو بھر دیا تھا
تُو نے اُنہیں ایک کر دیا تھا!

ہم بھی تو ترے ہی اُمتی ہیں
اُس لشکرِ اوّلیں کی صُورت
تجُھ سے ہی تو سلسلہ ہے اپنا
پھر کیا ہے کہ ہم میں اور اُن میں
ہلکی سی مشابہت نہیں ہے
اب گھر ہے نہ کوئی دل کشادہ
لگتا ہے کہ ہر درخت اپنے
سایے کے خلاف ہو گیا ہے
بھائی، بھائی کو کھا رہا ہے
خاکم بدہن، پہ تیرے ہوتے
کیا ہم پہ کسی کی بددُعا ہے
بستی یہ ہماری جس میں اب بھی
خوشبُو ترے نام کی بسی ہے
بارُود میں کیوں نہا رہی ہے

شعلے اسے کیوں نگل رہے ہیں
جو شہر کہ اپنی شخصیت میں
شبنم تھا، گلاب تھا، صبا تھا
اب آگ ہے، خون ہے، دھواں ہے
یہ شہر ہے، سانحہ ہے، کیا ہے
کوفہ ہے کہ کربلا ہے، کیا ہے

دشتِ غربت میں ہیں اور رنج سفر کھینچتے ہیں
بارِ ہستی ہے جسے خاک بہ سر کھینچتے ہیں

جن چراغوں کو میسّر نہیں اُس کی محفل
انتظار اُس کا سرِ راہگذر کھینچتے ہیں

زندگی پھر تجھے در پیش ہے زندانِ دمشق
اشقیا پھر ترے کانوں سے گہر کھینچتے ہیں

روشِ گُل پہ، یہ کس وضع کے صیّاد ہیں جو
باندھ کر طائرِ خوں بستہ کے پر کھینچتے ہیں

شہر سے جب بھی وہ جائے تو دُعاؤں کا حصار
دیدۂ نم مرے تا حدِّ نظر کھینچتے ہیں

جانتے ہیں کہ شکستہ ہے طنابِ اُمّید
خیمۂ جاں ترے کوچے میں مگر کھینچتے ہیں

تیری خوشس نامی کا آتا ہے بہت دل کو خیال
گریہ کرتے ہوئے آواز اگر کھینچتے ہیں

لگ گئی تھی تری کچھ پچھلے پہر آنکھ اے دل
آج سے ہم ترے نالے سے اثر کھینچتے ہیں

دل کو کچھ تیری توجہ کا بھی طالب پایا
تیری توصیف سے اب دستِ ہنر کھینچتے ہیں

کراچی — ۸۹ء کی آخری شام

عکسِ گُلِ تر جلا ہوا تھا
خوابوں کا نگر جلا ہوا تھا

یا دستِ دُعا نہ اُٹھ سکا تھا
یا اُس کا اثر جلا ہوا تھا

ہر گھر تھا لُٹا ہوا کئی بار
اَور بارِ دگر جلا ہوا تھا

یا نوچ لئے گئے تھے پتّے
یا سارا شجر جلا ہوا تھا

آنکھوں کی جگہ پہ آبلے تھے
اور تارِ نظر جلا ہوا تھا

ملبہ تھا تمام شہرِ خوبی
اور ہو کے کھنڈر جلا ہوا تھا

تہہ خانۂ جاں میں تجھ کو رکھتی
لیکن مرا گھر جلا ہوا تھا

کچھ دیر کا سوختہ نہ تھا شہر
یہ آٹھ پہر جلا ہوا تھا

پرواز کا اتنا ڈر قفس میں
ٹوٹا ہوا پر جلا ہوا تھا

منزل تھی غبارِ راہ میں گم
اور رختِ سفر جلا ہوا تھا

جب ہو کے صبا کوچۂ تعزیر سے آئی
آواز عجب حلقۂ زنجیر سے آئی

خوشبو کا دریچہ بھی کھلا رنگ کے ہمراہ
اک یاد بھی لپٹی ہوئی تصویر سے آئی

گل لے گئے عطار، ثمر کھا گئے طائر
سورج کی کرن باغ میں تاخیر سے آئی

پہلے بھی کشش جلوۂ دنیا میں تھی لیکن
اس بار ترے حسن کی تاثیر سے آئی

سادہ تھا بہت خواب ترا چشم تمنا
مشکل میں نظر کثرت تعبیر سے آئی

یوں سارے چراغ اور گلاب اپنی جگہ میں
رستے میں چمک سایۂ رہگیر سے آئی

شہرِ جمال کے خس و خاشاک ہو گئے
اب آئے ہو جب آگ سے ہم خاک ہو گئے

ہم سے فروغِ خاک نہ زیبائیِ آب کی
کائی کی طرح تہمتِ پوشاک ہو گئے

پیراہنِ صبا تو کسی طور سِل گیا
دامانِ صد بہار مگر چاک ہو گئے

اے ابرِ خاص: ہم پہ برسنے کا اب خیال
جل کر ترے فراق میں جب راکھ ہو گئے

قائم تھے اپنے عہد پہ یہ دیدہ ہائے غم
کیا یاد آ گیا ہے کہ نمناک ہو گئے

اب تک جنوں ہی اپنا اثاثہ رہا مگر
تجھ سے ملے تو صاحبِ ادراک ہو گئے

خوشبو تو بن نہ پائے سو کچھ ہم سے بے ہنر
اے موجۂ صبا ترے پیچاک ہو گئے

نثری نظمیں

ندامت

میری تمام نظموں کا انتساب اب تک صرف میرے اپنے نام رہا
اور میں خود کو محبت کی شاعرہ سمجھ کر
خوش ہوتی رہی
میں نے کوڑے کے ڈھیر پر بلّی کی طرح چلتا ہوا بچّہ نہیں دیکھا
میں نے اینٹ کا تکیہ بنا کر سوتا ہوا راج نہیں دیکھا
راج سے میرے ذہن میں
ہمیشہ راج ہنس آئے
اور بچّوں سے تازہ گلاب
میں کیک کو روٹی کا متبادل سمجھتی رہی
میرے بچّے
میرے راج
ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا!

بشیرے کی گھر والی

ہے رے تیری کیا اوقات!
دُودھ پلانے والے جانوروں میں
اسے سب سے کم اوقات
پُرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی
جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا
تیرے پھول سے ہاتھوں میں
تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی
ماں کا آنچل پکڑے پکڑے
تجھ کو کتنے کام آ جاتے
اُپلے تھاپنا
لکڑی کاٹنا
گائے کی سانی بنانا
پھر بھی مکھن کی ٹکیہ
ماں نے ہمیشہ بھیا کی روٹی پہ رکھی

تیرے لئے بس رات کی روٹی
رات کا سالن
روکھی سوکھی کھاتے
موٹا جھوٹا پہنتے
تجھ پہ جوانی آئی تو
تیرے باپ کی نفرت تجھ سے اور بڑھی
تیرے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر
ایسی کڑی نظر رکھی
جیسے ذرا سی چُوک ہوئی
اور تُو بھاگ گئی
سولھواں لگتے ہی
ایک مرد نے اپنے من کا بوجھ
دوسرے مرد کے تن پہ اُتار دیا
بس گھر اور مالک بدلا
تیری چاکری وہی رہی
بلکہ کچھ اور زیادہ
اب تیرے ذمے شامل تھا
روٹی کھلانے والے کو
رات گئے خوش بھی کرنا

اور ہر ساون گابھن ہونا
پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی
پتی کا ساتھ
بس بستر تک
آگے تیرا کام!
کیسی نوکری ہے
جس میں کوئی دیہاڑی نہیں
جس میں کوئی چھٹی نہیں
جس میں الگ ہو جانے کی سرے سے کوئی ریت نہیں
ڈھوروں ڈنگروں کو بھی
جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں
پیڑ تلے سستانے کی آزادی ہوتی ہے
تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں
تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے
ہے رے!
کن کرموں کا پھل ہے تو
تن بیچے تو کسبی ٹھہرے
من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے

ٹ کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ اپمان
ایک نوالہ روٹی ،
ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان

ایک U. D. C کی ڈائری

میرا بچپن اپنے آپ کو لوریاں دیتے گزرا
اور جوانی
نیندوں کو خوابوں کی رشوت دیتے ہوئے
وقت ہمیشہ مجھے گالیاں دیتا رہا
اور زمانے نے بھی خوب ٹھڈّے لگائے
یہاں تک کہ رُلتے رُلاتے
میں ایک بدبُودار کمرے میں آن پہنچا
جہاں میرے چاروں طرف
قبل مسیح فائلیں تھیں
اور حنوط کئے ہُوئے میرے ہی جیسے کچھ کلرک
اور ایک آدھ اپنے وجُود سے شرمندہ چپراسی
ہم سارا وقت اِن فائلوں میں اپنی ناکیں دیے بیٹھے رہتے
اور افسروں کے موڈ کے مطابق
ان پر فلیگ لگاتے
خود ہم پر تو کبھی پی۔یو۔سیؔ کی چِٹ بھی نہیں لگی
شاید ہم وہ فائلیں ہیں

صا
PAPER UNDER CONSIDERATION

جنہیں خدا مارک کرنا بھول گیا
چنانچہ ہم ساری زندگی
ایک ہی میز پر دھرے رہے
اور ہم پر بے توجہی کی گرد جمتی رہی!

میں نے ایک بار
اس میز سے کھسکنے کی کوشش کی تھی
اور چپکے سے
اور فائلوں کے ساتھ نتھی ہو کر
اوپر چلا گیا تھا

اتنی سی بات پر
میرے افسر کے افسر نے
اس کی ماں بہن ایک کر دی تھی
اور اس نے منطقی طور پر ہماری
اس دن کے بعد سے
میں اپنی اوقات کبھی نہیں بھولا
(اور نہ میرا چھوٹا افسر)
اب میں گدھے کی سی دلجمعی سے نوٹ لکھتا ہوں
اور اس عبارت کے دوران

کبھی کبھی ٹوٹی ہوئی پیالی میں چائے پی لیتا ہوں
اور کبھی اُدھار سگریٹ کا ایک کش لگا لیتا ہوں
(جو میری واحد عیاشی ہے)
شام ڈھلے
اکڑی ہوئی ٹانگوں اور تختہ ہوتی کمر کو گھسیٹتے
بس اسٹاپ کی طرف نکل پڑتا ہوں
اور دَم گھونٹنے والی بسوں کے اندر ٹھنسے ہوئے ریوڑ کا
حصّہ بن جاتا ہوں
شام گئے گھر پہنچتا ہوں
جہاں میری جھنکتی ہوئی بیوی میری منتظر ہے
جو بیسواؤں کی طرح
پہلے میری جیب میں ہاتھ ڈالتی ہے
پھر بچّوں کو گلی سے باہر دھکیلتی ہے
رات گئے
۲۲ رُپے والے ڈالر کے زمانے میں
میں اپنے ۵ رُپے سالانہ اضافے کو
سوچ سوچ کر خوش ہوتا ہوں
اور انگلیوں پر
پراویڈنٹ فنڈ کا حساب کرتا ہوں
اور آنے والے بڑھاپے کو لوری دینے لگتا ہوں!

ٹماٹو کیچپ

ہمارے ہاں
شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے
ہر مرد خود کو اُس کا مخاطب سمجھتا ہے
اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا
اِس لئے اُس کا دشمن ہو جاتا ہے !

ساراؔ نے ان معنوں میں
دشمن کم بنائے
اس لئے کہ وہ وضاحتیں دینے میں
یقین نہیں رکھتی تھی
وہ ادیب کی جورو بننے سے قبل ہی
سب کی بھابھی بن چکی تھی
ایک سے ایک گئے گذرے لکھنے والے کا دعوی تھا
کہ وُہ اُس کے ساتھ سو چکی ہے
صبح سے شام تک
شہر بھر کے بے روزگار ادیب
اس پر بھنبھناتے رہتے

:صہ ساراشگفتہ
انکار

جو کام کاج سے لگے ہوئے تھے
وہ بھی
سڑی بُسی فائلوں اور بوسیدہ بیویوں سے اُوب کر
ادھر ہی آتے
(بجلی کے بل، بچّے کی فیس اور بیوی کی دوا سے بے نیاز ہو کر
اس لئے کہ یہ مسائل
چھوٹے لوگوں کے سوچنے کے ہیں)
سارا دن
ساری شام
اور رات کے کچھ حصّے تک
اَدب اور فلسفے پر دھواں دھار گفتگو ہوتی
بھوک لگتی تو
چندہ وندہ کر کے
نکڑ کے ہوٹل سے روٹی چھولے آجاتے
عظیم دانشور
اُس سے چائے کی فرمائش کرتے ہُوئے کہتے
تم پاکستان کی امرتا پریتم ہو
بے وقوف لڑکی

سچ سمجھ لیتی
شاید اس لئے بھی
کہ اُس کے نان و نفقہ کے ذمہ دار تو اسے ہمیشہ
کافکا کی کافی پلاتے
اور نرودا کے بسکٹ کھلاتے رہتے
اس رال میں لتھڑے ہوئے COMPLIMENT کے بہانے
اُسے روٹی تو ملتی رہی
لیکن کب تک
ایک نہ ایک دن تو اُسے بھیڑیوں کے جنگل سے نکلنا ہی تھا
سارا نے جنگل ہی چھوڑ دیا !
جب تک وہ زندہ رہی
ادب کے رسیا اسے بھنبھوڑتے رہے
اُن کی محفلوں میں اُس کا نام
اب بھی لذیذ سمجھا جاتا ہے
بس یہ کہ اب وہ اس پر دانت نہیں گاڑ سکتے
مرنے کے بعد انہوں نے اسے
ٹماٹو کیچپ کا درجہ دے دیا ہے !

اسٹیل ملز کا ایک خصوصی مزدور

کالا بھوت
جیسے کوئلے کے نطفے سے جنم لیا ہو
ایک جہنمی درجۂ حرارت پر رہتے ہوئے
اُس کا کام
دہکتی بھٹی میں کوئلے جھونکتے رہنا تھا
اُس کے بدلے
اُس کو اُجرت بھی زیادہ ملتی تھی
اور خوراک بھی خصوصی
اور ایک وقت میں چار گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا تھا
لیکن شاید اس کو یہ نہیں معلوم
کہ خودکشی کے اِس معاہدے پر
اُس نے
بقائمیٔ ہوش و حواس دستخط کئے ہیں
اس بھٹی کا ایندھن دراصل وہ خود ہے !

سمجھداری کی ایک نظم

باسو بہت رویا
اور مصر رہا کہ اُسے اُس کی زوجہ کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے'
نوجوانوں نے ایک دوسرے کو
آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنیاں ماریں
بوڑھوں نے اُسے خلل دماغ کہا
اور مولوی نے بدعت
باسو بڑی مشکل سے گھر لایا گیا !

وہ روز دفتر سے سید حامیوہ شاہ چلا جاتا
پھولوں اور اگربتیوں کے ساتھ
اُس کا کافی عرصے یہی معمول رہا
پھر جمعرات کے جمعرات
پھر ہر نوچندی کو
پھر عید' بقرعید اور شب برات
آخر میں برسی کے برسی

ایک دن چلچلاتی دھوپ میں
بس نمبر ۶۰ سے اترتے ہوئے
اُس کی نظر ایک پیڑ پر پڑی
تو اُسے دفتر میں رکھی گئی
نئی ٹائپسٹ کا خیال آ گیا
اُس دن اُسے احساس ہوا
کہ دُنیا ایک آدمی پر مشتمل نہیں ہے
بالآخر وہ بہت ہنسا

ایک مشکل سوال

ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے
ایک بارہ تیرہ سالہ چہرہ جھانکا
وہ چہرہ
بہار کے پہلے پھول کی طرح تازہ تھا
اور آنکھیں
پہلی محبت کی طرح شفاف !
لیکن اُس کے ہاتھ میں
ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں
اور اُن لکیروں میں
برتن مانجھنے والی راکھ جمی تھی
اُس کے ہاتھ
اُس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے !

یاسر عرفات کیلئے ایک نظم

آسمان کا وہ حصہ
جسے ہم اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھتے ہیں
کتنا دلکش ہوتا ہے
زندگی پر یہ کھڑکی بھر تصرّف
اپنے اندر کیسی ولایت رکھتا ہے
اس کا اندازہ
تجھ سے بڑھ کر کسے ہوگا
جس کے سر پہ ساری زندگی چھت نہیں پڑی
جس نے بارش سدا اپنے ہاتھوں پہ روکی
اور دھوپ میں کبھی دیوار اُدھار نہیں مانگی
اور برفوں میں
بس اک الاؤ روشن رکھا
اپنے دل کا
اور کیسا دل
جس نے ایک بار کسی سے محبت کی

اور پھر کسی اور جانب بھولے سے نہیں دیکھا
مٹی سے اِک عہد کیا
اور آتش و آب و باد کا چہرہ بھُول گیا
ایک اکیلے خواب کی خاطر
ساری عمر کی نیندیں گِروی رکھ دی ہیں
دھرتی سے اک وعدہ کیا
اور ہستی بھُول گیا
ارضِ وطن کی کھوج میں ایسے نکلا
دل کی بستی بھُول گیا
اور اِس بھُول پہ
سارے خزانوں جیسے حافظے واری
ایسی بے گھری اس بے چادری کے آگے
سارے جگ کی ملکیت بھی تھوڑی ہے
آسمان کی نیلاہٹ بھی میلی ہے !

دوست ملک کیلئے ایک نظم

محبت بیان نہیں رویہ ہے
اس بات کا اندازہ
ہمیں اس وقت ہوا
جب ہم نے
بہار کی سبز روشنی میں نہائے ہوئے بیجنگ پر قدم رکھا
رفاقت کی سوجھ بوجھ رکھنے والی خوشبو ہماری منتظر تھی

ہم ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے تھے
لیکن ہمارے ہاتھوں کی حرارت
اس ناواقفیت کی تلافی کر رہی تھی
ہمارے ہونٹ خاموش تھے
لیکن ہماری آنکھیں مکالمہ کر رہی تھیں
ہمارے درمیان وہ خاموشی تھی
جو بہت پرانے دوستوں کے بیچ ہوتی ہے !

عظیم ملک کے عظیم لوگ
جنہوں نے ایک روشن اور خوشگوار دن کیلئے
ایک طویل رتجگے کی ذمّہ داری قبول کی
جنہیں ہماری شناخت اپنی پہچان کی طرح عزیز ہے
جنہیں ہماری بے سرو سامانی کی خبر
سب سے پہلے ہو جاتی ہے
جو ہمارے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے
ہماری کلاہ سے کبھی نہیں کھیلتے
وہ لوگ کہ جن کے پاس رہتے ہوئے
ہمارے پاس کوئی ترجمان نہ بھی ہوتا
تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا
وہاں تو دلوں اور گھروں پر ایک دستک کافی ہے
پاکستان !
میں وہ بچی کس طرح بھول سکتی ہوں
جس کی آنکھیں مخملیں تھیں اور
اور جس کے چمکدار بالوں میں سُرخ ربن بندھا تھا
اور جو محض لباس سے ہمیں پہچان کر
ہم سے لپٹ گئی تھی !

راکاپوشی کے اُدھر جانے والی ہوا
اگر تجھے کوئی مخملیں آنکھوں
اور سُرخ ربن والی بچّی ملے
تو اس سے کہنا
ننھی پری
تمہارا ایک گھر
ہمالہ کے اِس طرف بھی ہے !

SAN FRANCISCO

حدِ نظر تک
زمین کا رنگ سبز ہے
اور ڈھلانوں پر
سُرخ رنگ کے گھر کِھلے ہوئے ہیں
اپنے مکینوں کی طرح
کشادہ دل
دو قدم چلیں
اور کوئی نہ کوئی شفّاف چشمہ
ایک شریر بچّے کی طرح
آپ پر پانی اُچھال دے
ذرا آگے بڑھیے
اور ایک ہلکورے لیتی جھیل
آپ کو اپنی مسکراہٹ کے ہالے میں سمیٹ لے
سارا شہر ہی باغ لگتا ہے
شام تک

تتلیاں آپ کے ہمراہ ہوتی ہیں
اور رات کو جگنو ہنستے ہوئے آجاتے ہیں
زمیں پر پاؤں رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کہیں کسی پھول پر نہ آجائے !

اے خدا
اس شہر کو ہمیشہ آباد رکھنا
یہ تیرے بندوں کو
تجھ سے قریب لاتا ہے !

ایک افسرِ اعلیٰ کا مشورہ

میرے ایک افسرِ اعلیٰ نے
ایک دن مجھے اپنی بارگاہِ خاص میں طلب کیا
اور ایک دو فائلوں کا حال پوچھنے کے بعد
میری غیر سرکاری مصروفیات پر چیں بہ جبیں ہوئے
معاشرے میں شاعر کی اوقات پر روشنی ڈالی
خلاصۂ گفتگو یہ کہ
ملک میں شاعر کی حیثیت وہی ہے
جو جسم میں اپنڈکس کی
بے فائدہ — مگر کبھی کبھی سخت تکلیف کا باعث
سو اس کا ایک ہی حل ہے — سرجری!
چشمِ تصور سے میری شخصیت کے اپنڈکس سے نجات پاکر
کچھ شگفتہ ہوئے
پھر گویا ہوئے
ایک آئیڈیل افسر وہ ہے
جس کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا

پہلے اُس کے ہونٹ غائب ہوتے ہیں
پھر آنکھیں
اس کے بعد کان
آخر میں سر
ہونٹوں آنکھوں کانوں اور سر سے نجات پائے بغیر
کوئی افسر، فیڈرل سیکرٹری نہیں بن سکتا!"

اپنی بات پر زور دینے کے لئے
انہوں نے دو ایک مشہور سر کٹے افسروں کا حوالہ دیا
لیکن میرے چہرے پر
شاید انہوں نے پڑھ لیا تھا
کہ یہ بے وقوف لوکل شاعر رہنے میں ہی خوش ہے
سو بدمزہ ہو کر
انہوں نے مجھے واپس جانے کی اجازت مرحمت فرمادی
اور میں بے وقوف
ایک نئی نظم کو سوچتی ہوئی اپنے دفتر لوٹ آئی
اپنی A.C.R میں
سُرخ روشنائی کے ایک ممکنہ اندراج کے باوجود!

ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ

میں نے اپنے لان میں احتیاط سے پانی دیتے ہوئے
کنٹونمنٹ بورڈ کو کافی بُرا بھلا کہا
بھلا یہ بھی کوئی کارکردگی ہے
جس میں پھُولوں کو پانی میسر نہ آسکے
میرے سارے امپورٹڈ پودے مُرجھائے جاتے ہیں!
میں نے دِل ہی دِل میں
ایک چلتے ہُوئے، اخبار کے مدیر کے نام
ایک مراسلہ بھی ڈرافٹ کر دیا
ابھی میں طنز کی دھار، غصّے کی سان پر رکھ رہی تھی
کہ مجھے باہر ایک بچّہ نظر آیا
جس کے دونوں کاندھوں پر
ایک ڈنڈا رکھا تھا
اور ڈنڈے سے دو کنستر بندھے ہوئے تھے
ننھے پھول نے اندر جھانکا
اور حسرت بھری نظروں سے پائپ کی طرف دیکھا

میرا دل کٹ گیا
مگر
میں نے اس سے کہا
بیٹے
اگر میں ان کنستروں میں پانی بھر دوں
تو ان کا وزن تمہارے وزن سے بڑھ جائے گا
تم ایک قدم نہیں چل سکو گے
اور گھر نہیں جا سکو گے
اور اچھے بچے دیر تک گھر سے باہر نہیں رہتے
بچے کی آنکھیں اچانک پچاس سال کی ہو گئیں
اُن میں ایک جھریوں بھرا زہر خند ابھرا
پھر وہ خاموشی سے
باہر چلا گیا !

میں نے اپنے ڈرافٹ کی عبارت میں
ایک سطر کا اور اضافہ کر دیا !

کراچی

کراچی
ایک ایسی بیسوا ہے
جس کے ساتھ
پہاڑوں، میدانوں اور صحراؤں سے آنے والا
ہر سائز کے بٹوے کا آدمی
رات گزارتا ہے
اور صبح اُٹھتے ہی
اُس کے داہنے رُخسار پر
ایک تھپڑ رسید کرتا ہے
اور دُوسرے گال کی توقع کرتے ہوئے
کام پر نکل جاتا ہے
اگلی رات کے نشے میں سرشار !

کلفٹن کے پُل پر...

کلفٹن کے پُل پر
جس سے شہر کی الیٹ گزرتی ہے
اور سو گز کی حد میں
ٹریفک پولیس کے چاق و چوبند جوان
ہمہ وقت ڈیوٹی دیتے ہیں
چھ، سات سادہ لباس والے بھی ہوں گے
اِرد گرد کوئی غیر متعلق پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا !
میں نے اُسے دیکھا !
گہرے نارنجی سوٹ میں ملبوس
جس پر بنا ہُوا ٹِلّے کا کام
مناسب مقامات سے مسکا ہوا تھا !
اس کی لپ اسٹک اتنی گہری تھی
کہ نظریں لتھڑ گئی تھیں
وسطِ مئی کی دھوپ میں، بہتا ہوا فاؤنڈیشن
یہ کہہ رہا تھا

کہ عمارت بھی کبھی حسین نہیں تھی
سستی سی نیل پالش میں ڈوبی ہوئی انگلیوں میں
ایک سگرٹ پھنسا تھا
جسے وہ دھواں دار پی رہی تھی
اس کی تمام حرکات و سکنات
دفعہ ۲۹۴ کے تحت قابلِ دست اندازیٔ پولیس تھیں
ٹریفک سگنل پر رُکے ہوئے میں نے سوچا
منٹو کی اس ہیروئن کا، یہ سپاہی
ابھی دھڑن تختہ کر دے گا
وہ اس کی طرف بڑھا بھی
لیکن اس سے قبل
کہ وہ اپنی نوٹ بُک نکالتا
گہرے نیلے نمبر پلیٹ کی ایک کار
اُس کے پاس رُکی
اور وہ اپنی دفعہ ۲۹۴ کے اشاروں سمیت
کار میں غائب ہو گئی
سفید کپڑوں والے سپاہی کی دونوں ایڑیاں
جُڑی کی جُڑی رہ گئیں!

کتنے برس لگے ...

کتنے برس لگے
یہ جاننے میں
کہ میرے اندر تیرا ہونا کیا ہے
ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا
شام ہوتے ہی
چاند میں روشنی نہیں آجاتی
رات ہوتے ہی
رات کی رانی مہک نہیں اُٹھتی
شام اور روشنی کے بیچ
رات اور خوشبو کے بیچ
ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے
جس کا ہماری زمین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا
اس آسمانی لمحے نے
اب ہمیں چھُو لیا ہے !

چاند کی روشنی میں لکھی گئی دو نظمیں

(۱)

شروع راتوں کا چاند تھا
پھر بھی
سارا باغ روشنی سے بھرا ہوا تھا
جیسے ہمارے دل
محبت سے!

(۲)

چاند کی آخری تاریخیں تھیں
کنج چمن کی خوشبو بھری تاریکی میں
اُس نے دیے کی لو کو اونچا کیا
اور میری آنکھوں میں جھانکا
پھر ہمیں کسی دیے کی ضرورت نہیں رہی !

I'LL MISS YOU

جانے سے پہلے
اُس نے میرے آنچل سے ایک فقرہ باندھ دیا
I'LL MISS YOU
سارا سفر
خوشبو میں بسا رہا!

مشورہ

ہماری محبت کی کلینکل موت واقع ہو چکی ہے !
معذرتوں اور عذرخواہیوں کا مصنوعی تنفس
اسے کب تک زندہ رکھے گا
بہتر یہی ہے
کہ ہم منافقت کا پلگ نکال دیں
اور ایک خوبصورت جذبے کو باوقار موت مرنے دیں !

اُسے اِس بات کا پتہ نہیں

اُس نے کہا
ہم جب بھی سفر پہ نکلتے ہیں
بارش ہمارے ساتھ ہو لیتی ہے
ایک تیسرے شخص کی طرح
اُس کے لہجے میں چھپی ہلکی سی خفگی پر
میں مسکرائے بنا نہ رہ سکی

مجھے احساس ہے
کہ کبھی کبھی
اُس کے کسی سوال کا جواب
میں بارش کو دے دیتی ہوں
مگر اُسے اِس بات کا پتہ نہیں
کہ جس حبس بھری دُنیا میں ہم رہتے ہیں

وہاں
بارش ہی ہماری دوست ہو سکتی ہے